اختر شیرانی

اور

اُس کی شاعری

بار اوّل

تعداد : گیارہ سو

۱۹۶۴ء

قیمت : پانچ روپے

اہتمام

م، ع، سلام آئینۂ ادب

چوک مینار - انارکلی لاہور

(اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی)

اختر شیرانی

محترم و مشفق خواجہ سعید الدین صاحب

کے نام

جن کی عظمت اور انسان دوستی میرے دل پر

نقش ہے

عنوانات

تعارف

اختر شیرانی ادب کے موجودہ دور کی ان گنی چنی شخصیتوں میں سے ہیں جن کے ارد گرد بے شمار جھوٹی سچی، من گھڑت، فرضی اور خیالی باتوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ لوگوں نے ذاتی علم اور تجربے کے بغیر محض سُنی سُنائی باتوں سے خیالات اور تصورات کا ایسا طلسم باندھ رکھا ہے کہ اس محبوب اور مقبول شاعر کی ذات میں جادو کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ جادو کی یہ تاثیر ان کے کلام میں بھی موجود ہے کہ اس سے بوڑھوں کے سرد دلوں میں شباب کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور جوانوں کے دل کی حرارت، التہاب بن کر پوری ہستی پر چھا جاتی ہے۔

اختر نقادوں کی زبان میں "شاعر رومان" ہیں اور اس رومان نے ان کے معاصر شاعروں پر بھی جادو چلایا ہے اور آنے والی پود کے دلوں میں بھی جگہ بنائی ہے۔

جب اختر شیرانی کا ذکر چھڑتا ہے تو بات گھوم پھر کر سلمیٰ کی گھنی زلفوں اور شبنمی عارضوں پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا سارا سکون انہی زلفوں کے سائے میں اور زندگی کی تمام تر خوشی انہی عارضوں کی ہم نشینی میں ہے۔

اختر شیرانی اور اس کی سلمیٰ نے بیسویں صدی کے شاعر کو عشق اور حسن کا ایک معیار دیا ہے۔ لیکن نہ اختر کا کوئی مقلد عشق کے اُس مقام تک پہنچتا ہے جو شاعرِ رومان نے اپنے لئے وضع کیا تھا۔ اور نہ ہی کسی کی سلمیٰ کو حسن کی دنیا میں محبوبی کا وہ رتبہ حاصل ہوتا ہے جو اختر نے سلمیٰ کو دیا تھا۔ اختر کی رومانی شاعری اور ان سے متاثر ہو کر اس نغمے کو الاپنے والوں کی رومانی شاعری کا سب سے بڑا فرق یہی ہے اور یہ فرق شخصیتوں اور مزاجوں کے فرق نے پیدا کیا ہے۔

رومان اور رومانیت دوسروں کے لئے ایک رسمی اور رواجی چیز ہے۔ اختر کے لئے یہ ان کے دل کی دھڑکن اور اس دھڑکن کی آواز ہے۔ یہ رومان اُن کی شخصیت کے قوی محرکات کا جیتا جاگتا عکس ہے۔ اس رومان میں اختر کی شخصیت کی بھرپور توانائی ہے۔ اس رومان کی پرورش سچی محبت کے صحتمند سائے میں ہوئی ہے اِس لئے یہاں فرار نہیں سپردگی ہے، افسردگی نہیں نشاط و طرب ہے۔ مایوسی نہیں اُمید کا ولولہ ہے یہ رومان 'جذبِ صادق' اور شوقِ فراواں کا دوسرا نام ہے۔

اختر نے اپنی رومانی شاعری کے ذریعے زندگی کی کڑی دھوپ میں چھاؤں تلاش کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور اس کی جانفزا نوید بھی سُنائی ہے ــــــ اس محبت میں خلوص ہے۔ سچائی ہے۔ دیانت ہے اس لئے اس کے لہجے میں نہ پردہ داری ہے نہ جھجک۔

حسن کا احساس اختر کے دل کا سب سے قوی اور یقیناً سب سے غالب احساس ہے۔ اس لئے اختر کی رومانی نظر جس طرح سلمیٰ کے گیسوؤں اور عارضوں کو اپنے دلِ بیتاب کا ملجا و ماویٰ سمجھتی ہے۔ اسی طرح حسنِ فطرت کی آغوش میں بھی

مسرور و مطمئن ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری حسنِ محبوب کا آئینہ بھی ہے اور حسنِ فطرت کا بھی ۔ اور اس آئینے میں حسن کی دونوں کیفیتیں پوری آب و تاب سے اپنا جلوہ دکھاتی ہیں ۔

افسوس ہے کہ اس زمانے نے بہت جلد اختر کے اُس احسان کو بھلا دیا جو اُس کی "رومانی شاعری" نے ہماری شاعری پر کیا تھا ۔ اس معنی میں کہ اس شاعری نے رومان کے تصور کو ایک صحت مند اور پاکیزہ تصور بنا دیا ، اور اس لئے ضرورت تھی کہ اختر کے کلام کو پھر منظرِ عام پر لایا جائے ۔ ایس اختر جعفری صاحب نے یہ انتخاب مرتب کر کے ایک اہم ادبی تقاضے کو پورا کیا ہے ۔ انتخاب دلکش اور نہایت عمدہ ہے اور انتخاب کرنے والے کے حسنِ ذوق پر دلالت کرتا ہے ۔ انتخاب سے پہلے کا دیباچہ بھی اِس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ اس سے کلامِ اختر کے نمایاں پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں ؛

۲۸ ر اگست ۱۹۶۳ء

سید وقار عظیم

یونیورسٹی اورینٹل کالج

لاہور

کی نشرواشاعت میں شب وروز تگ و دو کررہا تھا - اور ہر کوئی اپنے افکار اور منصوبوں کو عملی صورت میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ یہ دور مختلف دبستانوں اور مختلف نظریات میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ اسی زمانے میں بے شمار سماجی - سیاسی - تہذیبی - تمدنی اور معاشرتی اقدار تبدیل ہو رہی تھیں اور بہت سی نئی قدریں ملک میں تدریج پا رہی تھیں - پرانے اور فرسودہ خیالات و تہذیب کی جگہ نئی تہذیب اور نئی روشنی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ پرانی رسومات، سماجی بندھنوں اور وضعداری کو ترک کر کے معاشرت کے نئے انداز اپنا رہے تھے - اردو کی جگہ انگریزی زبان کا دور دورہ تھا مگر ان حالات کے باوجود بعض لوگ اپنی پرانی روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے اور وہ ان روایات سے سرِ مُو بھی سرکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ نئی تہذیب اور نئی اقدار کے سراسر خلاف اور متنفر تھے - اس کے برعکس مغرب زدہ طبقہ پرانی تہذیب و تمدن اور فرسودہ نظریات کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکنے پہ تلا ہوا تھا - اُن کو زمانے کا ساتھ نہ دیتی ہوئی یہ روایات ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں ان کے علاوہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو ان دونوں طبقوں اور تہذیبوں کے مابین زندگی کی مسافت طے کر رہا تھا - یعنی پرانی اور نئی تہذیب کے درمیانی راستے پہ گامزن تھا - بالکل یہی سماجی - سیاسی اور معاشرتی اقدار کے بدلتے ہوئے رجحانات اردو ادب پہ بھی مسلط تھے - مغربی ادب کے اثرات دھیرے دھیرے اردو ادب کے جسم پہ کافی حد تک سرایت کر چکے تھے اور ادب میں کئی ایک تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں - نئے نئے تجربات کئے جا رہے تھے - ہیئتی

دیباچہ

اختر شیرانی کا دور عجیب تشائم دور ہے۔ کیونکہ اس دور میں ایسے بے شمار دبستان اور ان کے مختلف نظریات منصۂ شہود پہ آئے جن کے لئے ہندوستان کے سیاسی پلیٹ فارم پہ عرصہ سے دھواں دھار تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ گوکھلے اور تلک، ہوم رول کا مطالبہ کر رہے تھے۔ گاندھی جی انگریزی سامراج سے ٹکر لینے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ محمد علی جناح مسلمانوں کی آزادی کے لئے تگ و دو میں مصروف تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کا ایوان آزادی زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ نیند کے ماتے ہندوستانی دھیرے دھیرے آنکھیں کھول رہے تھے۔ حالی کی مدھم راگنی ان کو خواب غفلت سے بیدار کر رہی تھی۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کے مصداق اس دور کا ہر دبستان اور سیاسی جماعت مختلف خیالات و نظریات کی علمبردار تھی اور ہر شخص اپنے نظریات

کی نشرو اشاعت میں شب و روز تگ و دو کر رہا تھا - اور ہر کوئی اپنے افکار اور منصوبوں کو عملی صورت میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ یہ دور مختلف دبستانوں اور مختلف نظریات میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ اسی زمانے میں بے شمار سماجی - سیاسی - تہذیبی - تمدنی اور معاشرتی اقدار تبدیل ہو رہی تھیں اور بہت سی نئی قدریں ملک میں تدریج پا رہی تھیں - پرانے اور فرسودہ خیالات و تہذیب کی جگہ نئی تہذیب اور نئی روشنی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ پرانی رسومات، سماجی بندھنوں اور وضعداری کو ترک کر کے معاشرت کے نئے انداز اپنا رہے تھے - اردو کی جگہ انگریزی زبان کا دور دورہ تھا مگر ان حالات کے باوجود بعض لوگ اپنی پرانی روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے اور وہ ان روایات سے سرِ مُو بھی سرکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ نئی تہذیب اور نئی اقدار کے سراسر خلاف اور متنفر تھے - اس کے برعکس مغرب زدہ طبقہ پرانی تہذیب و تمدن اور فرسودہ نظریات کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکنے پہ تلا ہوا تھا۔ اُن کو زمانے کا ساتھ نہ دیتی ہوئی یہ روایات ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں ان کے علاوہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو ان دونوں طبقوں اور تہذیبوں کے مابین زندگی کی مسافت طے کر رہا تھا۔ یعنی پرانی اور نئی تہذیب کے درمیانی راستے پہ گامزن تھا - بالکل یہی سماجی - سیاسی اور معاشرتی اقدار کے بدلتے ہوئے رجحانات اردو ادب پہ بھی مسلّط تھے - مغربی ادب کے اثرات دھیرے دھیرے اردو ادب کے جسم پہ کافی حد تک سرایت کر چکے تھے اور ادب میں کئی ایک تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں - نئے نئے تجربات کئے جا رہے تھے - ہیئتی

تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ نئے نئے منکشفات۔ نظریات اور خیالات منظر عام پر آ رہے تھے۔ اسی زمانے میں اگر آپ علی گڑھ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں تو سر سید احمد دہلوی اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے دن رات کوشاں نظر آئیں گے۔ وہ مسلمانوں کو نئی تہذیب اور نئی اقدار سے روشناس کرانے، ان میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے اور انھیں زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ دیکھنے کے لئے نہایت جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ مسلمانوں کو پستیوں سے نکال کر انھیں اعلیٰ سرکاری منصبوں پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ ادھر پنجاب میں علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو ان کی عظمتِ گزشتہ، اسلاف کے کارنامے اور واقعاتِ رفتہ کے حسین مرقعے دکھا کر ان میں آزادی کی روح پھونک رہے ہیں اور انھیں داستانِ پارینہ سنا کر وہی پرانی سادہ زندگی بسر کرنے اور جذبۂ عمل کی طرف راغب کر رہے ہیں اور نہایت ولولہ انگیز لہجہ میں بیداری کا پیغام دے رہے ہیں ؎

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرم تماشا تو بھی ہو

اگر لکھنؤ کی طرف دیکھیں تو پنڈت برج نارائن چکبست اپنے مخصوص انداز میں۔ رامائن و مہابھارت کی طویل داستانیں پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی ایسی جوشیلی نظمیں بھی کہتے ہیں جن میں وطنیت اور آزادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ان کا اپنا رنگ اور اپنا انداز ہے۔ ہندوستانی سپوتوں کو وہ مادرِ گیتی اور دھرتی ماتا کی پوجا کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

اسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی انقلاب زندہ باد کے پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو انگریزی راج کے پنجۂ استبداد سے رہا کرا کے آزادی کے سرسبز حسین مرغزاروں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انقلاب زندہ باد کا نعرہ ہر شخص کی زبان سے سُننے کے متمنّی ہیں۔ جوش ملک میں انقلاب برپا کر کے پُرانی اقتدار کی بساط یک دم اُلٹ دینا چاہتے ہیں۔ اُن کے کلام اور تخلص میں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے ؎

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

دوسری جانب دیکھئے تو سیماب اکبرآبادی، عزیز لکھنوی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی اپنی پرانی روشوں پر گامزن دکھائی دیتے ہیں جو کسی زمانے میں میر اور سودا نے دریافت کی تھیں اور اُن کے سامنے غزل کا وہی میدان موجود ہے جس میں مصحفی و انشا، ناسخ و آتش کئی مرتبہ اشہبِ افکار دوڑا چکے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ سیماب، جگر، عزیز اور اصغر بھی اسی میدان کے سواروں میں سے ہیں۔ اگرچہ ان سب کی منزل ایک ہی ہے مگر راستے جُدا جُدا ہیں۔ سب ہی منزل پہ پہنچنے کی سعیٔ پیہم میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مگر ان سب سے الگ تھلگ زمانہ کا اثر اور رنگ قبول کئے بغیر

اختر شیرانی محبت و اُلفت کے نشہ میں سرشار چناروں کی جانفزا چھاؤں میں بیٹھے حسن و عشق کے دلربا گیت گا رہے ہیں۔ اور اپنے احساسات و جذبات اور وارداتِ قلبی کو اشعار کے لئے سانچوں میں ڈھالتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے نغموں میں زندگی، جوش، حسن، اصلیت، سوز، درد، روانی، ترنم، شباب مسرت و بہجت، محبت و اُلفت اور ہیجان غرضیکہ سبھی کچھ ہے۔ یہ نغمے اُن کی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں اور خونِ جگر سے پرورش پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں وہ تمام شعری محاسن بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ جو ایک اچھی شاعری کا طرۂ امتیاز ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعری دراصل نغمات کی شاعری ہے جس میں شعریت کے علاوہ موسیقیت و غنائیت بھی موجود ہے۔ یہی غنائیت موسیقیت اور شعریت کا مرکب اختر شیرانی کی شاعری کہلاتا ہے۔

موسیقیت

اختر شیرانی کی شاعری کی روحِ رواں اور بنیادی خصوصیت ان کی موسیقیت و غنائیت ہے اور یہ غنائیت صرف انہی سے مخصوص ہے اور انہی کا حصہ ہے۔ اس غنائیت و موسیقیت سے اُن کی شاعری کو الگ کر کے دیکھنا گوشت کو ناخن سے الگ کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ایک بہت بڑے موسیقار ہیں اور موسیقی کے جملہ نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں موسیقی کا شدید طوفان اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس طوفان میں اس قدر جوش اور روانی ہے کہ قاری کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اور اس کے دل اور رُوح

کے دامن کو مسرتوں کے پھولوں سے بھر دیتا ہے اور قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - یہ موسیقیت کی فضا اختر کی تمام شاعری پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے - اسی لئے اُن کی شاعری میں حُسن، دلکشی اور جاذبیت جیسے عناصر اُجاگر ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک اچھے موسیقار کی طرح موسیقی کے ہر سُر تال سے پُوری طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ شاعری میں موسیقی پیدا کرنے کے لئے کن کن ذرائع کو کس کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور اُن سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے لہٰذا وہ ان مختلف ذرائع کو مختلف طریقوں سے مختلف مقامات پہ استعمال کرتے ہیں۔ کہیں وہ مترنم قوافی اور ردیفیں استعمال کر کے موسیقی پیدا کرتے ہیں - کہیں گاتی بجاتی اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی بحریں لاتے ہیں - کہیں نرم و شیریں اُردو، ہندی اور بھاشا کے الفاظ استعمال کر کے روانی اور غنائیت پیدا کرتے ہیں - پھر الفاظ کی تکرار اور حروف کے آہنگ سے ایک چالاک فن کار کی مانند ایسا صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں جس میں بے حد لوچ، بانکپن اور حسن ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر شیرانی حروف کی صوتیات اور ان کے مناسب استعمال سے اچھی طرح آگاہ ہیں - اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کس کس حرف کے استعمال سے موسیقیت کے عنصر میں اضافہ ہو سکتا ہے چنانچہ وہ ویسے ہی الفاظ موقع اور محل کے مطابق اشعار میں سموتے جاتے ہیں اسی لئے ان کے یہ الفاظ لڑی میں پروئے ہوئے اُن موتیوں کی مانند ہوتے ہیں جن میں چمک اور کشش دونوں موجود ہوتی ہیں — مثلاً

دامانِ خرابہ زار میں ہے	اک شاعرِ نوجوان کی تربت
یا وادیٔ نو بہار میں ہے	اک نکہتِ رائگاں کی تربت

شاعر کو مگر خبر نہیں کچھ وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اُس پہ نہیں حال کا اثر کچھ جاگا تھا ، غریب سو رہا ہے

ان اشعار میں اختر شیرانی نے حرف "ر" کی تکرار سے حسرت اور سوگواری کے جذبے کی شدت کو ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حرف "ر" کا صوتی آہنگ حسرت بھرے مضامین ادا کرنے کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ لہٰذا شاعر کی تربت کی حسرت اور ویرانی کو اور زیادہ اُجاگر کرنے کے لئے "ر" کی تکرار سے کام لیا ہے اور جذبے کی اس شدت کو نمایاں کرنے میں وہ یہاں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اسی طرح حروف "س" اور "ش" کی آوازیں سکون ، سکوت اور خاموشی جیسے موضوعات کو ادا کرنے میں بیحد ممد و معاون ہوتی ہیں۔ یہ آوازیں نہ صرف موضوع کے پس منظر کو اُبھارتی ہیں بلکہ اُس میں زور اور حسن بھی پیدا کرتی ہیں۔ ذیل کے اشعار میں ان حروف کی صوتیات سے پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے اختر نے شام کی خاموش فضا، اندھیرے کے دلچسپ سکوت اور گلیوں کی شمعوں پہ پھیلے ہوئے سایوں کے منظر کو نہایت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور گلیوں کی دُھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کے اندھیرے گوشوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا۔

ان اشعار میں دیس - سے - شام - سڑکوں - دلچسپ - شمعوں - سایوں - بسیرا - جس - گوشوں - سو بیا ایسے الفاظ ہیں جن میں "س" اور "ش" کے حروف آتے ہیں - اختر شیرانی نے ایسے الفاظ یکجا کر کے نہ صرف منظر میں حُسن پیدا کیا ہے بلکہ بے حد روانی اور موسیقی پیدا کی ہے - بس یہی موسیقی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے علاوہ ازیں اختر شاعری میں موسیقی پیدا کرنے کے لیے گاتی بجاتی بحریں اور مترنم ردیفیں بھی استعمال کرتے ہیں - ایسی ردیفوں اور بحروں سے شاعری میں موسیقی کے علاوہ بے پناہ روانی اور بلا کا حُسن پیدا ہو جاتا ہے - اشعار ملاحظہ ہوں -

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ نکہتیں، یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ مستیاں یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں
شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں
نظر نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں
فضا میں خوابِ حسیں بن کے چھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

موسیقی کے لحاظ سے اختر شیرانی کو اگر بہت بڑا ساحر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ اپنی دلنواز اور دل گدازموسیقی سے قاری کو اس طرح مسحور کر لیتے ہیں کہ وہ موسیقی کے اس جذبات انگیز سیلاب میں یوں بہہ جاتا ہے کہ اس کے دل و دماغ کے علاوہ روح بھی گنگنانے لگتی ہے۔ محترمہ کنیز فاطمہ حیاؔ "نغمۂ حرم" کے دیباچہ میں اختر شیرانی کے موسیقانہ اشعار کی تعریف میں لکھتی ہیں۔ "ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس "اختر تابندہ" کی پُر کیف ضیا باری اپنی مست اور خنک کرنوں سے قلوب کو مسخر اور دل کی تاریک گہرائیوں کو روشن کر چکی ہے۔ مزید برآں شاعر کے موسیقانہ اشعار سے جو معنوی عقیدت جوہر شناسانِ ادب کو ہے وہ بر بنائے" غواص را پیرس گوہر رابیں"۔ محض مصنف "نغمۂ حرم" کے شعور مخفی کا تاثر ہے۔ جس کے لئے بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اختر شیرانی کی تقریباً ساری شاعری ایک ایسی وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے جس کے سُر سنگیت شاعر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں اور خونِ جگر سے پرورش پا کر قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی اختر شیرانی کا کمال ہے۔ اُن کی نظم "انتظار" ایسی ہی غنائیت اور موسیقیت کا اعلیٰ نمونہ ہے

بہار و کیف کی بدلی اُتر آئے گی وادی میں

سرود و نور کا کوثر چھلک جائے گی وادی میں

نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں

شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

مری آغوش میں ہوگا وہ جسم مرمریں اس کا
وہ اس کے کاکل مشکیں وہ روئے نازنیں اس کا
وہ رخسار حسین اس کے وہ حسن یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

ان کی اس موسیقی اور غنائیت سے متاثر ہو کر ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا :

"اختر شیرانی کی شاعری فلسفہ و تصوف کی بجائے عشق مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے ۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور ان کی تمام شاعری پہ جوانی چھائی ہوئی ہے ان کی شاعری کی روح تغزل ہے اور وہ اس روح تغزل اور غنائیت کو اپنی تمام شاعری پہ پھیلا کر الفاظ کی ترکیب اور اپنی انفرادی رنگینی سے کلام میں عجیب و لولہ انگیز ترنم پیدا کر دیتے ہیں "

اور حقیقت ہے کہ یہی نغمگی اور ولولہ انگیز ترنم اختر کی شاعری کی روح رواں ہیں ۔

رومانیت

اردو ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والا ہر شخص نہایت آسانی سے کہہ سکتا

ہے کہ اختر شیرانی رومانی شاعر تھے یا اختر شیرانی کی شاعری رومانیت سے بھرپور ہے۔ مگر یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ رومانی شاعری ہوتی کیا ہے؟ یا رومانیت کن عناصر ترکیبی سے معرض وجود میں آتی ہے۔ رومانیت حسن و عشق یا محبت و اُلفت کی نشاط انگیز میٹھی میٹھی جادو بیانی، سحر طرازی اور خارجیت کی مصوری کو بھی ہم رومانیت کا نام نہیں دے سکتے اور نہ ہی الفاظ تراشی اور رعنائی شاعری کو رومانیت کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں رومانیت زندگی کی ایک خاص طرح کی کیفیت کا نام ہے جس میں عقلیت سے زیادہ جذباتیت کے عناصر غالب ہوتے ہیں بلکہ جذباتی کیفیات کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے عقلی کیفیات کا رنگ قدرے ماند پڑ جاتا ہے بلکہ کسی حد تک جذباتی رنگ میں ہی مدغم ہو جاتا ہے اسی جذباتی رنگ کا تازیانہ جب قوتِ متخیلہ کے رہوار پہ لگتا ہے تو اُس میں برق کی سی تیزی اور شاہینِ قہستانی کی سی بلند پروازی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سدرۃ المنتہا سے بھی آگے، بہت آگے نکل جاتا ہے اور شاعر دور — بہت دور افق کے اُس پار اپنی نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ اِس نئی دنیا میں اُسے آرام و راحت، سکون و امن، مسرت و شادمانی، یک جہتی و ہم آہنگی، حسن و رعنائی، دلکشی و زیبائی محبت و اُلفت غرضیکہ وہ تمام نعمتیں اُسے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہتی ہیں جن سے وہ اس مادی دنیا میں محروم رہتا ہے۔

بالفاظ دیگر رومانیت روح اور دل کی مخصوص بالیدگی کا نام ہے جس کی بنا پر روح کا افق وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لامکاں کی تنغومر کو چھونے لگتا ہے۔ پھر اس افق پہ ایک نہیں بلکہ ہزاروں مہر وماہ درخشاں دکھائی

دیتے ہیں جن کی ضیا باری سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے اور رومانی شاعر اس جگمگاہٹ اور روشنی میں ایک طرح کی دلی مسرت اور ذہنی سکون محسوس کرتا ہے جو اس کے لئے مادی دنیا میں سرے سے ہی مفقود ہوتا ہے۔ مگر اُسے روح اور تخیل کی دُنیا میں میسّر آتا ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی رُومانیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ

"نفس کی ایک مخصوص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں جن میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں اور تخیل کے سمند ناز کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے ۔ یا پھر تخیل و جذبات کا اُبھر جانا رومانیت کی روح رُواں ہے اور رومانیت کی ایک اہم خصوصیت انفرادیت ہے مگر انفرادیت رومانیت کا سبب نہیں نتیجہ ہے۔ رومانی تخیل کائنات کو ایک نئے طور پر دیکھتی ہے اور رومانی جذبات عالم کو ایک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں اور ان کا لازمی نتیجہ انفرادیت ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ ایک رومانی شاعر اِس جہانِ رنگ و بو کے مصائب و تکالیف، غم و آلام، سماجی بندھنوں، معاشرتی قیود، مکاریوں، فریب کاریوں اور تخریب پسندی کے بولوں سے دامن بچانے کے لئے اُس دُنیا میں پناہ لیتا ہے۔ جو اُس کے تخیلات کی پیداوار ہوتی ہے جس میں اُسے مادی دُنیا کی چیخ و پکار، آہ و فغاں اور نالہ و شیون سُنائی نہیں دیتے بلکہ شہنائی کے سُریلے دلنواز نغمے سُنائی دیتے ہیں جو روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہی اُس کی رومانی دُنیا ہے جہاں اُس کی شاعری رومانیت کی سُہانی آغوش میں پرورش پاتی ہے"۔

جس طرح سڈنی نے یوٹوپیا (UTOPIA) یعنی ایک تخیلاتی دنیا کا تصور پیش کیا تھا اور یہ تصور دراصل اس مادی دنیا کے مصائب و آلام کا ردِ عمل تھا۔ ان مصائب و آلام سے گھبرا کر سڈنی نے یوٹوپیا میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ سڈنی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شیلے (SHELEY) نے (ODE TO THE SKY LARK) جیسی لازوال نظم کی تخلیق کی۔ اس نظم میں شیلے بیان کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی دُنیا میں جانے کا آرزومند ہے جہاں ہوائیں، فضائیں اور گھٹائیں رقص کرتی ہیں جہاں خوشیوں کے چشمے بہتے ہیں، بادل ہواؤں کے دوش پر اُڑتے ہیں۔ سمندر کی پرجوش لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں اور خوش آیند آوازیں پیدا کرتی ہیں جہاں صداقت حُسن ہے اور مکاری، فریب کاری اور جذبات کشی کا سایہ تک نہیں

شیلے کی طرح اُردو ادب میں اختر شیرانی بھی سکون و امن اور عالمِ حُسن کی تلاش میں اس مادی دُنیا سے دُور — بہت دُور تخیلات کی دُنیا میں چلے جانے کے متمنی ہیں جہاں ہر طرف حُسن کے جلوے اور رنگینیاں ہیں۔ صداقت اور حقیقت ہے سکون اور مسرت ہے۔ غرضیکہ وہ سبھی کچھ ہے جو اس مادی دُنیا میں موجود نہیں کیونکہ یہ مادی دنیا اختر کے نزدیک، ایک ایسی پاپ کی نگری ہے جہاں انسان نہیں، حیوان، وحشی اور درندے آباد ہیں جہاں ارمان کچلے اور مسلے جاتے ہیں اور امیدوں کا خون ہوتا ہے۔ انسان ابدی نیند سوتا ہے اور فتنہ و شر جیسے تخریبی عناصر ہمہ وقت بیدار رہتے ہیں۔ یہ دنیا جذبات کا مذبح اور آرزوؤں کا مقتل ہے۔ یہاں خود غرضی۔ سرد مہری۔ شر پسندی۔ نفس پرستی اور انسان کشی جیسے ناپاک اور زہریلے خیالات جنم لیتے ہیں۔ اسی لئے اختر زہرِ عشق سے التجا کرتے ہیں۔

اے عشق کہیں لے چل

یہ جبر کدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے
ارمانوں کا قاتل ہے امیدوں کا رہزن ہے
جذبات کا مقتل ہے جذبات کا مدفن ہے

چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک مذبح جذبات و افکار ہے دُنیا
اک مسکن اشرار و آزار ہے دُنیا
اک مقتل احرار و ابرار ہے دُنیا

دور اس سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر اس مطلب پرستوں کی دنیا سے بے حد بیزار نظر آتے ہیں لہٰذا اسے نفرت کدہ عالم بلکہ لعنت گہہ ہستی کہہ کر پکارتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ مقہور و مجبور نفس پرستوں کی ایک ایسی بستی ہے جہاں پاپ کے زہریلے ناگ روپ بہروپ دھار کر انسانیت کو ڈستے ہیں اور اس کی رگوں سے صداقت و شرافت کا خون چوس کر حیاسوزی - نفرت اور عداوت کا زہر بھر دیتے ہیں ؎

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے لعنت گہہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے

دُور اور کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

دراصل اختر شیرانی نفس پرستوں کی اس دنیا کو چھوڑ کر ایک ایسی دُنیا میں جانے کے خواہشمند ہیں جہاں پاپ، خودغرضی، نفس پرستی، تنزلپسندی اور جذبات کشی کے عفریت کے بھیانک سایے نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ دُنیا پاکیزہ جذبات و احساسات کا مقتل اور مدفن ہے بلکہ وہ ایک ایسی دُنیا ہے جہاں طور کی مانند نور یزداں کی بارش ہوتی ہے۔ کوہساروں پر گھٹائیں گھر گھر کر آتی ہیں۔ گیت گاتے ہوئے چشمے اور دریا بہتے ہیں۔ صحراؤں، ہواؤں، فضاؤں اور وادیوں پر ہمیشہ ایک خواب کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ بادل پریوں کی مانند ساری کائنات کو اپنے سفید پروں کی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ پھر مینہ کی پھوار پڑنے لگتی ہے۔ اِس دنیا کے ذرّے ذرّے سے حوروں کا معصوم تبسّم اور حسن ازلی جھلکتا ہے اور تمام سرزمین جنّت کی مانند تقدیس کے نور میں دُھل جاتی ہے۔ پھولوں کے کنج مہکتے ہیں۔ پودے ہواؤں کے جھولوں میں لٹکتے ہیں۔ ستارے جھلملاتے ہیں اور طیورِ خوش الحان میٹھے سروں میں محبّت و سکون کے سہانے نغمے گاتے ہیں۔ بہاریں رقص کرتی ہیں ؂

اے عشق ہمیں لے چل اک نور کی وادی میں

اک خواب کی دنیا میں، اک طور کی وادی میں

حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تا خلد بریں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی لہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں

اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی کی یہ رومانی دنیا ایسی پرسکون اور امن وامان کی دُنیا ہے جہاں برکھا رُت میں گھنگھور گھٹائیں چاروں اور چھا جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں مستانہ ہوائیں ہزاروں مے خانے اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے جھومتی جھامتی چلی آتی ہیں۔ خوشیوں کے پھول مسکراتے ہیں۔ چاندنی راتیں دیوانہ وار رقص کرتی ہیں۔ پریوں کے دلربا نغمے کوہساروں اور وادیوں میں گونجتے ہیں۔ شباب و حُسن کی رنگین بہاریں آبشاروں کی صورت میں فضاؤں میں گیت بکھیرتے ہوئے پہاڑوں کی رفعتوں سے وادیوں میں گرتی ہیں۔ یہی وہ دُنیا ہے جو اختر کی رومانی اور تخیلاتی دُنیا ہے۔ جہاں پہنچنے کے لئے وہ اپنی محبوبہ سلمیٰ کا آنچل تھامتے ہوئے کہتے ہیں : ؎

جہاں شام وسحر نیلی گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
اُفق کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
فضاؤں میں بہاریں ہی بہاریں لہلہاتی ہیں
جہاں فطرت مچلتی ہے لہکتے ابر پاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

بہشتوں کی لطافت ہے جہاں کی زندگانی میں
مزہ آتا ہے کوثر کا جہاں کے سادہ پانی میں
خدائی حسن عریاں ہے جہاں کی نوجوانی میں
صداقت کروٹیں لیتی ہے سازِ دل کے تاروں میں

مری سلمیٰ، مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

محاکات

اختر شیرانی جہاں بہت بڑے موسیقار ہیں وہاں بہت بڑے مصور اور بُت گر بھی ہیں۔ وہ مصوری اور بُت تراشی کے فن سے اسی طرح واقف ہیں جس طرح موسیقی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مو قلم سے ایسی بے مثال تصویریں اور بُت بناتے ہیں جو نہ صرف اپنے حسن و جمال میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں بلکہ جذبات و احساسات کی دولت سے بھی مالا مال ہوتے ہیں۔ ان کی تصویریں اور مجسمے انسانی صفات سے کلی طور پر متصف ہوتے ہیں اور اُن میں زندگی کی لہریں عام انسان کی طرح رقص کناں ہوتی ہیں۔ گویا اختر شیرانی ایسی لاجواب تصویریں بناتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح بولتی چالتی ہنستی گاتی اور مسکراتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اُن کی فن کاری کا کمال ہے کہ وہ بے جان الفاظ کے ذریعے ایسی لاثانی تصویریں بناتے ہیں جو زندگی کی جملہ رعنائیوں اور زیبائیوں سے پوری طرح مزین ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں بہت بڑا مصور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان کی اکثر تصویریں نمایاں اور واضح ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ

تصویریں بڑے کینوس پر بناتے ہیں اور تصویر بناتے وقت معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ یہی معمولی جزئیات اکثر اُن کی تصویر اور اُس کے پس منظر کو نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ پھر ان تصویروں میں جذبات و احساسات کا رنگ بھر کے ان کے خدوخال اور نقوش اس طرح اُجاگر اور گہرے کر دیتے ہیں کہ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور لوحِ دل پر اُن کے نقوش اس قدر مرتسم ہو جاتے ہیں کہ وقت اور زمانہ انھیں کبھی بھی محو کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ وقت اور زمانہ کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر نے ان میں ایسے رنگین عناصر شامل کر دئے ہیں جو اَنمٹ ہیں اور زندۂ جاوید ہیں۔ اختر ان تصویروں میں اپنے خونِ جگر سے رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اسی خونِ جگر کی بنا پر ان کی تمام تصویریں اور مجسمے غیر فانی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور ابدیت کے دائرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دِل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اور یہ مسلمہ امر ہے کہ فن خواہ مصوری ہو یا سنگ تراشی، کتابت ہو یا موسیقی کوئی فن ہو جب تک اُس میں فنکار کا خلوصِ دل اور خونِ جگر شامل نہ ہو اس وقت تک فن کو معراج حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی فنکار کوئی عجوبۂ روزگار تخلیق کر سکتا ہے جس کو دیکھ کر ناظرین انگشت بدنداں رہ جائیں اور جو فن کار کی شہرت و

عظمت کا باعث بن سکے - جس طرح گوئٹے کا فاؤسٹ، لیناردو کی مونالیزا، ملٹن کی گم شدہ جنت (PARADISE LOST) نطشے کا مردِ کامل اور اقبال کا مردِ مومن دُنیا کے ایسے زندۂ جاوید شہکار ہیں جو سراپا ابدیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور لافانی دامنٹ ہیں جو صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے فنکاروں کے نام روشن کر رہے ہیں - چنانچہ معلوم ہوا کہ فن میں زندگی اور حسن پیدا کرنے کے لئے فنکار کو خلوصِ دل اور خونِ جگر سے کام لینا پڑتا ہے - خونِ جگر سے فن نہ صرف رفعتوں سے ہمکنار ہوتا ہے بلکہ اس میں جاودانی عناصر پیدا ہو جاتے ہیں جو فن کے ساتھ فنکار کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتے ہیں -

اختر شیرانی اپنی تصویروں کے لئے رنگ چونکہ خونِ جگر اور خلوصِ دل سے تیار کرتے ہیں لہٰذا اُن کی تصویروں میں ابدیت ہے جاودانی رنگ ہے - انمٹ عناصر ہیں -

مثلاً اپنی محبوبہ سلمیٰ کی تصویر بے جان الفاظ کے ذریعے کچھ اس طرح خوبصورت اور جاندار بناتے ہیں کہ قاری دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے

یہ معصومانہ چہرہ غنچۂ شاداب کا عالم
یہ مستانہ نگاہیں، اک بہشتی خواب کا عالم
سراپائے خیالِ حور، جسمِ نازنیں تیرا
مجسم خندۂ خواب پری روئے حسیں تیرا
یہ موتی، یہ جبیں، یا انجم و مہتاب کا عالم

پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم

تو از سر تا بپا اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ

شراب و شعر و موسیقی میں پنہاں تیری رنگت ہے

مرے خاموش دل میں موجزن تیری محبت ہے

بہار اور خواب کا ہیکل، تری تصویر ہے سلمیٰ

ان اشعار کو پڑھ کر آنکھوں کے سامنے فوراً ایک ایسی نوجوان دوشیزہ کی تصویر آجاتی ہے جس کا معصوم بھولا بھالا چہرہ پھولوں کی مانند شگفتہ ہے اور آنکھوں میں خمار و مستی کے پیمانے چھلک رہے ہیں۔ گورا جسم کسی نازنیں حور کے مرمریں بدن کی یاد تازہ کرتا ہے۔ پیشانی چاند ستاروں کی مانند درخشاں ہے جس پر ژولیدہ زلفیں عجب ستم ڈھا رہی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے سیاہ بادلوں میں چاند گھرا ہوا ہو۔ اُس کا معصوم حُسن شراب و شعر و موسیقی کا مرکب ہے۔

اختر نے اس تصویر میں محاکات سے پورا استفادہ کرتے ہوئے ایسی رنگ آمیزی کی ہے جس نے تصویر میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ اختر شیرانی اپنے رنگین برش سے ایک ایسی لڑکی کی تصویر بناتے ہیں جو اندھی ہے۔ یہ اندھی لڑکی جو نوجوان و نوخیز دوشیزہ ہے، ساحلِ دریا سے پانی کی گاگر بھر کر لکڑی ٹیکتی ہوئی گھر واپس آرہی ہے۔ اُس کی جوانی کا کنول شگفتہ ہے۔ وہ جوان ہونے کے علاوہ حسین بھی ہے۔ اُس کے معصوم چہرے پر سرخ و سفید رنگ کی لکیریں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ رخسار پھولوں کی مانند سرخ

اور نرم ہیں۔ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک ہیں۔ لمبی سفید گردن اور نازک کندھوں پر سیاہ زلفیں ناگنوں کی طرح لہرا رہی ہیں۔ سینے پر معصومیت کا نور نمایاں ہے۔ سینہ اور بازو کسی حد تک کھلے ہیں جن میں سے گورا بدن جھانک رہا ہے اور بدن پر سرخ و سفید لکیریں اور طرح طرح کی قوسیں عجب ستم ڈھا رہی ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ خاموش ہے لیکن اس کے دل میں جذبات و احساسات کا محشر بپا ہے۔ وہ قدرت کی ستم ظریفی پر بے حد ملول ہے۔ اُسے رہ رہ کر یہ غم ستا رہا ہے کہ قدرت نے اسے بینائی سے کیوں محروم کر دیا؟ اور اس کا دامن کیوں اس نعمت سے خالی رہ گیا۔؟ وہ گھرے سرمئی بادلوں کی گھن گرج سُن رہی ہے۔ پھولوں کی جانفزا خوشبو سونگھ رہی ہے۔ ہواؤں اور فضاؤں میں نمی اور خنکی محسوس کر رہی ہے۔ ساحلِ دریا سے ٹکراتی ہوئی موجوں کا ترنم سن رہی ہے۔ سبزہ و گل کی لہک محسوس کر رہی ہے مگر افسوس کہ وہ قدرت کے اس خزینے کو دیکھنے سے عاری ہے۔ ان تمام مناظر کو دیکھنے کی حسرت اس کے دل میں غم کا سنگین پتھر بن کر رہ گئی ہے جسے وہ کبھی بھی اور کسی صورت بھی دُور نہیں کر سکتی۔ اس کی بے نور نگاہوں کے سامنے یہ تمام چیزیں ایک انتہا تاریک اندھیرے کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ اُسے اندھیرے کے دبیز پردے کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اختر کی یہ لافانی تصویر اور اس کے جذبات و احساسات و جذبات ملاحظہ ہوں:

آسماں پر ہیں گھنیری بدلیاں چھائی ہوئی
نیلگوں پریاں اڑی جاتی ہیں گھبرائی ہوئی

اِس بہارستان کے دامن میں ہے محوِ خرام
ایک محرومِ نظر دوشیزہ گھبرائی ہوئی

سینہ و بازو پہ عریانی کے جلوے موجزن
شانہ و بازو پہ کافر زلف بکھرائی ہوئی

ایک لکڑی کے سہارے ہاتھ میں پانی لئے
آرہی ہے ساحلِ دریا سے گھبرائی ہوئی

پاؤں رکھتی ہے کہیں جلدی میں پڑتا ہے کہیں
سبزہ پر پھسلی ہوئی ٹھوکر سے گھبرائی ہوئی

راستے میں سوچتی جاتی ہے دل ہی دل میں یوں
مجھ پہ فطرت کی یہ کیسی ظلم فرمائی ہوئی

آج کے دن کیوں نہ حاصل ہوگئیں آنکھیں مجھے
آج کے دن کیوں نہ حاصل ان کو بینائی ہوئی

اک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں
چار سو ہے دھندلی دھندلی سی گھٹا چھائی ہوئی

رات دن، شام و سحر، یکساں ہیں سب میرے لئے
اک سیاہی سی ہے، ہر دم ہر طرف چھائی ہوئی

سنتی ہوں تارے چمکتے ہیں فلک پر رات کو
جن کی تابانی سے ہیں شمعیں بھی شرمائی ہوئی

میں سمجھتی ہوں کہ ہر سو اک دھوئیں کی تہہ ہے
اور میں اس میں تیرتی پھرتی ہوں گھبرائی ہوئی
الغرض وہ اس طرح کی آرزو دل میں لئے
جا رہی ہے اپنے گھر کی سمت گھبرائی ہوئی

اسی طرح نورجہاں، ریحانہ، عذرا، جوگن اور رقاصہ اختر شیرانی کی ایسی لافانی تصویریں ہیں جو سراپا ابدیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر کو تصویردار الفاظ اور تراکیب استعمال کرنے میں بیحد مہارت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری خوبصورت لفظی تصویروں کا اعلیٰ مرقع بن گئی ہے۔ یہ محاکاتی رنگ اختر شیرانی کی شاعری کا جزوِ اعظم اور طرۂ امتیاز ہے۔

فطرت پرستی

اختر شیرانی محض فطرت نگار ہی نہیں بلکہ بہت بڑے فطرت پرست بھی ہیں اور اس فطرت پرستی میں ان کا خلوص، محبت اور شوق شامل ہے۔ وہ فطرت سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک فطرت کسی جامد یا ساکن کیفیت کا نام نہیں بلکہ فطرت، جمال و زیبائی اور حسن و رعنائی کے دلچسپ امتزاج کا نام ہے جس میں ہمہ وقت زندگی کی لہریں موجزن رہتی ہیں۔ اسی لئے فطرت کے اندر کشش و جاذبیت کی سی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں اور اسی کشش و جاذبیت کی بنا پر اختر کو فطرت سے والہانہ لگاؤ اور عشق ہے۔ گھنگھور گھٹائیں

نیلی فام سیاہ بادل ۔ ساون کا مہینہ ۔ برکھارت ۔ صبا کے نم آلودہ جھونکے ۔ عطر میں ڈوبی ہوئی ہوائیں ۔ خاموش فضائیں ۔ پرندوں کی میٹھی صدائیں ۔ چڑیوں کی چہک ۔ کلیوں اور پھولوں کی مہک ۔ افق پر شفق کے پھول ۔ سرسبز و شاداب چمن ۔ باغوں میں بہاریں ۔ جگمگاتے ہوئے ستارے ۔ چمکتا ہوا چاند ۔ بہتا ہوا پانی ۔ لب نہر پھولوں کا جھومنا ۔ کوہساروں پر بجلیوں کا کوندنا ۔ جھرنوں کا گرنا چشموں کا گیت گانا ۔ شاخوں کا خوشی سے جھومنا ۔ غرضیکہ اختر کو فطرت کی ہر شے سے بے پناہ محبت ہے ۔ پیار ہے ۔ والہانہ لگاؤ ہے اور یہ فطرت نگاری یا فطرت پرستی ان کی شاعری میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ ان کی شاعری کو اس سے الگ کر کے دیکھنا ہی ناممکن ہے ۔ فطرت کا یہ جمالیاتی ذوق قدم قدم پر ان کا دامن دل کھینچتا ہے اور ان کی نگاہیں از خود اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ تو وہ فطرت کی نیرنگیوں میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنے گرد و پیش کا قطعاً احساس نہیں رہتا ۔

برکھارت میں جب چاروں اور سے نیلی فام گھٹائیں گھر گھر آتی ہیں، تو فضاؤں میں امرت رس گھول دیتی ہیں ۔ چمن و دمن باغ و راغ کھل اُٹھتے ہیں ۔ پھول مسکرانے لگتے ہیں ۔ سبزہ لہلہاتا ہے ۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے ستاروں کی مانند زمین پر گرتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سفید موتیوں کی بارش ہو رہی ہو ۔ وادیوں میں بہاریں رقص کرتی ہیں ۔ کوہساروں پہ برق کا تازیانہ لہراتا ہے اختر یہ منظر دیکھتے ہی جھوم اُٹھتے ہیں اور بے اختیار گنگنانے لگتے ہیں :۔

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں

ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چمن شگفتہ دمن شگفتہ گلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں پتیاں مسکرا رہی ہیں
یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں کہ ننھے تارے ڈھل رہے ہیں
اُفق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں
نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
کہ ساری دُنیا ہے اک سمندر ہوائیں جس میں نہا رہی ہیں
چمن ہے رنگیں بہار رنگیں مناظر سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں

جب ساون کا مہینہ آتا ہے تو ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکے بدن میں گدگدی پیدا کر دیتے ہیں۔ خوشبوؤں میں بھیگی ہوئی ہوا جوان دلوں میں اُمنگیں بیدار کر دیتی ہے۔ ایسے سمے گاؤں کی الھڑ دوشیزائیں گھنے پیپل کی چھاؤں میں جھولا جھولنے کو گھروں سے باہر نکل آتی ہیں۔ اس وقت چھم چھم مینہ برستا ہے۔ کوئل کی مدھ بھری آواز باغ کے کنجوں میں گونجتی ہے۔ پپیہے پی ہو۔ پی ہو کی صدائیں لگاتے ہیں۔ جھینگر شور مچاتے ہیں۔ مور رقص کرتے ہیں۔ پھولوں کی کیاریاں مہکنے لگتی ہیں۔ بارش میں دھلی ہوئی شاخیں لچکتی ہیں تو سب سکھیاں مل جُل کر جھولا جھولتی ہیں اور ساون کے مدھر گیت گاتی ہیں۔ یہ دلربا منظر اختر کو بے حد پسند ہے اور وہ اس سہانے منظر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوب جانا چاہتے ہیں اور ان کی بیشتر نظموں میں اس منظر کی عکاسی اس طرح کی

غمازی کرتی ہے کہ انھیں ایسے مناظر سے والہانہ محبت ہے۔ نغمۂ حرم میں ایک
نظم خاص "جھولا" کے عنوان سے لکھی ہے جس میں ایسے ہی دلفریب منظر کی
عکاسی نہایت موزوں انداز میں کی ہے ؎

آیا ساون کا مہینہ نظر آیا جھولا	دل کو بھایا مری آنکھوں میں سمایا جھولا
چولی دامن کا سا ہے ساتھ گھٹا کا اس کا	اس طرف آئی گھٹا اس طرف آیا جھولا
مست ہے جھولے کی نہ کیوں آج خدائی جھومے	ننھی کلیوں کو ہواؤں نے جھلایا جھولا
پینگ بڑھنے لگی آنچل کو گھٹا کے چھونے	باغ میں سکھیوں نے اس طرح جھلایا جھولا
گیت سُن سُن کے گھٹائیں بھی بہک اٹھی ہیں	مل کے سکھیوں نے کچھ اس جھوم کے گایا جھولا

پھول ہلتے ہیں ادھر شاخ لچکتی ہے اُدھر
یا بہاروں کو ہے قدرت نے جھلایا جھولا

برسات کے موسم میں جب سکھیاں جھولا جھولتی ہیں اور مل کر باغوں میں خوشیوں
کے گیت گاتی ہیں جن گیتوں میں جوان دلوں کی دھڑکنیں اور سانسوں کی مہک رچی
ہوئی ہوتی ہے۔ سکھیاں ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑاتی ہیں اور قہقہے لگاتی
ہیں تو اس منظر کو دیکھ کر ایک ہجراں نصیب جوان بیوی کا دل مسوس کر رہ جاتا ہے
جس کا خاوند اس سے دُور پردیس گیا ہوا ہے۔ ایسے میں اس کی یاد بیوی کے جوان
دل میں غم کے نشتر چبھو رہی ہے۔ گھنگھور گھٹائیں، برکھا کی پھوار دیکھ کر وہ
بیتاب ہوئی جاتی ہے اور اس کا دل سیماب وار تڑپنے لگتا ہے اور وہ بے اختیار
کہہ اُٹھتی ہے ؎

یہ بھیگی رت، یہ مستانہ ہوا یہ برسات کا موسم

بہاروں کا سماں یہ رس بھرے جذبات کا موسم
کئی ہمسن ہیں جو باغوں میں جاکر گیت گاتی ہیں
کئی جھولا جھلاتی ہیں، کئی پینگیں بڑھاتی ہیں
کسی کو چھیڑتی ہے کوئی، کوئی مسکراتی ہے
کسی پہ کوئی چشمے میں کھڑی چھینٹیں اُڑاتی ہے
پھسلتا ہے کسی کا پاؤں کوئی بھاگ جاتی ہے
کوئی بھیگی ہوئی سی کنج گُل میں گنگناتی ہے
مگر میں بدنصیب ان شوخ باتوں کو ترستی ہوں
مسرت کے دنوں، اُلفت کی راتوں کو ترستی ہوں
گھٹائیں دیکھ کر بیتاب ہو جاتی ہوں رہ رہ کر
سراپا پیکرِ سیماب ہو جاتی ہوں رہ رہ کر

مظاہر قدرت میں چاند ستاروں کو بھی بے حد اہمیت حاصل ہے جو حسن اور خوبصورتی چاند کی مدھر چاندنی اور ستاروں کے دھیمے انداز میں ٹمٹمانے، نور کی ہلکی ہلکی کرنیں بکھیرنے اور ٹھنڈی دلنواز روشنی پھیلانے میں مضمر ہے شاید ہی کسی اور منظر فطرت میں موجود ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ فطرت کے حسن کا صحیح پرتو ستاروں کی دلبری میں ہی نہاں ہے۔ لیکن اختر کے نزدیک یہ چاند، ستارے نور کی ایسی چھوٹی چھوٹی بے شمار دنیائیں ہیں جہاں ندیاں بہتی ہیں اور چشمے گاتے ہیں۔ خوشیوں کے پھول مہکتے ہیں اور کلیاں چٹکتی ہیں۔ پرندے سبز شاخوں پہ بیٹھے گیت گاتے ہیں۔ نور کا بے پناہ سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہے اور ہر شے

شانتی اور امن کی میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہے اور چاند اختر شیرانی کے نزدیک ایک ایسی مرمریں دیوی کا مجسمہ ہے جو نیلے آسمان کے وسیع و عریض مندر میں نصب ہے اور جس کا ادیکار شکتی اور شانتی ہے ۔
چنانچہ چاند کے متعلق لکھتے ہیں :

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

اور ستاروں کے بارے میں فرماتے ہیں :

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بیتاب شرارے

علاوہ ازیں چاند ستارے اُن کے ہاں ایسی خوبصورت اور روشن قندیلیں ہیں جن سے وہ محبوب کی آمد پر اپنے کاشانے کو آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے ہیں جن کی نورانی روشنی سے اپنے کاشانہ کو منور دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ عشرتِ آغوش (محبوبہ) آج پھر اُن کی آغوش میں آئی ہے ؎

ماہ و انجم سے کہو زینتِ کاشانہ بنیں
کہ پھر آغوش میں وہ عشرتِ آغوش آیا

سلمیٰ

عرب کے زمانۂ جاہلیت میں بڑے بڑے سالانہ میلے لگتے تھے۔ اور ان میلوں میں اکثر عالی شان مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے جن میں اس عہد کے مشہور شعراء اپنے اپنے کلامِ اعلیٰ سے سامعین کو نوازتے تھے۔ ان میں سے سال رواں کا جو بہترین کلام ہوتا تھا۔ سونے کے پانی سے لکھ کر کعبہ میں آویزاں کر دیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں عام رواج تھا کہ شاعر کلام میں اپنی محبوبہ کا حقیقی نام استعمال کرنے کی بجائے اُسے فرضی نام سے مخاطب کرتا تھا۔ چنانچہ چند ایک فرضی نام مثلاً عذرا۔ عنیزہ اور سلمیٰ وغیرہ بہت مقبول ہو گئے تھے اور تقریباً ہر شاعر اپنی محبوبہ کا صحیح نام استعمال کرنے کی بجائے ان فرضی ناموں کا ہی سہارا لیتا تھا۔ لہٰذا اختر شیرانی کے ہاں بھی سلمیٰ کا نام عربی شاعری سے مستعار لیا گیا ہے ورنہ حقیقت میں سلمیٰ نام کی کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جس سے اختر والہانہ عشق کرتے تھے اور رات دن اُسی کے گیت گاتے رہتے تھے۔

سلمیٰ کا نام اختر کی شاعری میں اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ وہ خود ایک زندہ حقیقت بن گئی۔ جس سے انحراف دشوار ہو گیا ہے کیونکہ اختر شیرانی نے اس نام کے ساتھ ایسے واقعات، حالات، جذبات و احساسات اور خیالات پیش کئے ہیں جو عشقِ مجازی میں ناگزیر ہیں اور جو تقریباً ہر عاشق کو مادی عشق میں پیش آتے ہیں۔

مثلاً جب ایک عاشق کو عشق میں مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کسی صورت بھی وصالِ محبوب ممکن دکھائی نہیں دیتا تو وہ اپنی زندگی کو

آنسوؤں اور آہوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ یا پھر بے حد مایوسی اور ناکامی کی حالت میں اپنی زندگی کو شراب و ساغر میں ڈبو دیتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں کے تاریک غاروں میں دھکیل دیتا ہے کیونکہ وہ اِس دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہنا چاہتا ہے۔ بالکل ایسے ہی حقیقی جذبات کی ہو بہو عکاسی اختر نے اپنی ایک غزل میں کی ہے۔

دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کر لوں گا
تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
اگر مجھے نہ ملیں تم، تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

پھر ایک جگہ اور اسی طرح عشق میں مایوس ہو کر فرماتے ہیں

رسم فرہاد ہے دنیا میں ابھی تک زندہ
یہ تماشا بھی کبھی ہم کو دکھا دینا تھا
ہو کے ناکام ہوس کار بنے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

غرضیکہ یہ سب وہی جذبات و احساسات ہیں جو ایک عاشقِ صادق کو عشق کی منزل میں عموماً پیش آتے ہیں۔ اختر ان جذبات کی عکاسی اِس طرح فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں کہ اُس کی صداقت میں کسی قسم کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے اشعار پڑھ کر قاری کو لا محالہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ سلمیٰ نام کی عزوار کوئی
ایسی لڑکی ہو گی جس سے اختر عشق فرماتے ہوں گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ
کسی لڑکی کا نام نہیں تھا اور نہ ہی اختر کو کسی ایسی لڑکی سے محبت تھی جس کا نام
سلمیٰ ہو۔ یہ محض ایک فرضی نام ہے جو عربی شاعری سے مستعار ہے۔ مگر یہ اختر کا
بہت بڑا کمال ہے کہ انھوں نے ایک فرضی نام کو ایسے خوبصورت انداز سے نسائی
پیکر میں ڈھالا ہے کہ وہ ایک پیچ رپچ گوشت پوست کی جیتی جاگتی نوجوان حسین
دوشیزہ بن گئی ہے جو شرم و حیا کی پُتلی۔ محبت کی دیوی۔ حسن و رعنائی کا مجسمہ
اور جمال و زیبائش کا حسین پیکر ہے اور جملہ نسوانی خصوصیات سے ہر طرح
مزین ہے جس کو اختر بے حد پیار کرتے ہیں اور اس کی ہر ادا پہ جان اپنی نثار کرتے
ہیں۔ جمالِ سلمیٰ ۔ سلمیٰ (نور جہاں کے مزار پر)۔ وقت کی قدر۔ انتظار۔ سلمیٰ ۔
ایک تصویر دیکھ کر ۔ اعترافِ محبت۔ بستی کی لڑکیوں میں ۔ ایسی بے شمار
نظمیں ہیں جن میں اختر و سلمیٰ کے عشق و محبت کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں ۔ اور جن
سے اُن کے عشق کی صداقت کی تائید ہوتی ہے۔ انہی نظموں کو سامنے رکھ کر بہت سے
لوگوں نے اختر و سلمیٰ کے بارے میں بے شمار جھوٹی حکایتیں اور روایتیں گھڑ لی
ہیں ۔ اور ان کو بڑے بے ڈھب طریقے سے مشتہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر
عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں :" اختر کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آتا ہے اور
وہ لفظ ہے سلمیٰ ۔ اس نام نے اختر کی ذات اور کلام کے بارے میں بہت سی حکایتیں
اور روایتیں وابستہ کر دی ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس نام کی آڑ میں اپنا
ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے اور بعض ستم ظریف تو دعویٰ کرنے سے بھی نہیں

ہچکچاتے۔ کہ اختر جب رات کو سلمیٰ سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان سے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔" ڈاکٹر موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں: "اگر بیس سال کے تعلقات کچھ حقیقت رکھتے ہیں اور اگر ان تعلقات کے بعد کوئی شخص اختر کو جاننے اور پہچاننے کا تھوڑا بہت دعویٰ کر سکتا ہے تو مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ میں نے اس طویل مدت میں اختر کے ہاتھ میں نہ تو کسی خاتون کا لٹکتا ہوا آنچل دیکھا اور نہ ہی انھیں کسی جھکتے ہوئے دروازے پہ دستک دیتے دیکھا۔ وہ صرف شراب کے رسیا تھے اور اُن کی تمام دوستیاں اور دشمنیاں شراب کے پیالے میں غرق ہو کر رہ گئی تھیں۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ اختر کو عنفوانِ شباب میں ضرور کہیں عشق ہوا ہوگا۔ اور یہ غالباً اُسی عشق کی چنگاری تھی جس نے آگے چل کر اُن کی شاعری کو شعلوں میں تبدیل کر دیا تھا۔"

سلمیٰ دراصل اختر کے ہاں ایک نصب العین (IDEAL) ہے جس تک پہنچنے کی وہ ہر ممکن سعی کرتے ہیں اور جو مرکزی خیال کی طرح ان کی تمام شاعری پہ مسلط ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں جذبات، احساسات اور خیالات کا شدید طوفان اُمڈتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جس کے ذکر سے ان کی شاعری ایک چنگاری سے شعلۂ جوالہ بن گئی ہے۔ اُن کی شاعری کے حسن و جاذبیت، خیال آفرینی، جذبات نگاری، منظر نگاری، محاکاتی رنگ، لمسیاتی پہلو اور غنائیت کے عنصر کا واحد محرک سلمیٰ ہے اور سلمیٰ ان کے نزدیک ایک ایسی نوجوان دوشیزہ کا نام ہے جو نسائیت کے تمام جذبات و احساسات اور خصوصیات کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہے جس کا حسن بے مثال، گفتگو

لاجواب اور مرمریں پیکرِ لاثانی ہے اور کائنات کی تمام خوبصورتی اس کے حسن کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اگر مسکراتی ہے تو ساری کائنات خوشی سے جھوم اٹھتی ہے وہ روتی ہے تو سارا جہان آنسو بہانے لگتا ہے۔ اگر وہ سوتی ہے تو ستارے اور کہکشاں تک محوِ خواب ہوتے ہیں۔ وہ بیدار ہوتی ہے تو پھول مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کلیاں چٹک کر مژدۂ جانفزا سناتی ہیں۔ بادِ نسیم کے خنک جھونکے اس کے خوبصورت بالوں میں کنگھی کرتے ہیں۔

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت بے خودی سے مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے
وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دنیا کو اٹھاتی ہے
وہی ارمانِ ہستی ہے! وہی ایمانِ ہستی ہے
بدن کہیے اگر ہستی کو تو وہ جانِ ہستی ہے

غرضیکہ اس دنیا کا سارا نظام شمسی یعنی عورت کے محور کے گرد گھوم رہا ہے اور اگر یہ محور نہ ہو تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے بلکہ اختر تو یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر عورت اس سرزمین پر قدم نہ رکھتی تو یہ تمام جہاں ایک ویران ماتم کدہ ہوتا۔ دنیا اور زندگی میں کوئی حسن اور دلچسپی نہ ہوتی۔ کائنات کی ہر چیز بے کیف، اداس اور ویران دکھائی دیتی۔

حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت
جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت

اگر عورت نہ آتی کل جہاں ماتم کدہ ہوتا
اگر عورت نہ ہوتی ہر مکاں اک غم کدہ ہوتا
جہاں میں کرتی ہے شاہی مگر لشکر نہیں رکھتی
دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی
اُسی کی بُو ہے دنیا کے لہکتے غنچہ زاروں میں
اُسی کا رنگ گلشن کی مہکتی نو بہاروں میں
اُسی کے نغمے جنت کے مچلتے آبشاروں میں
اُسی کا نُور قدرت کی بہاروں جلوہ زاروں میں
بہارِ آفرینش ہے شبابِ زندگانی ہے
جوانِ فطرت کا اک کھویا ہوا خوابِ جوانی ہے

ایس اختر جعفری۔ ایم اے
ماڈل ٹاون۔ لاہور

۲۲۔ جون ۱۹۶۳ء

صبحِ بہار

پہلا مجموعۂ کلام

صُبحِ بہار

جوگن

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے

غمگیں نوائیوں سے بے خود بنا رہی ہے
دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے

بیدار کر رہی ہے مدہوش گھاٹیوں کو
خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اُڑا رہی ہے

اٹکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے

اک گیروا سی ساری ہے جسمِ مرمریں پر
یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

اک بحرِ یاسمیں پر لہرا رہی ہے ناگن
یا اُس کی زلفِ مشکیں سینہ پہ آ رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

وادی میں سحر جزتن ہے نغموں کا کیف لرزاں
ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے

اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلے پر
گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے

یا جل پری، روپہلی موجوں کے بربطوں پر
تاروں کے دیوتا کو نغمے سنا رہی ہے

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اُس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے

طاؤس ناچتے ہیں، یوں بے قرار ہو کر
گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن
یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا رہی ہے

ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتما میں
ہر کی پریم اگنی لَو کے لگا رہی ہے

ہر بن میں ہر ڈگر میں، ہر گھر میں ہر نگر میں
بچھڑ کے اپنے من کی چِنتا مٹا رہی ہے

اک آگ سی بھری ہے غمگین راگنی میں
دیپک سُنا سُنا کر تن من جلا رہی ہے

روحانیت کے نغمے لب پر تڑپ رہے ہیں
مُلکِ عدم کی جانب سب کو بلا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

دُنیا سے ہو رہی ہے بیزار میری ہستی
دل ہاتھ سے چلا ہے جاں لب پہ آ رہی ہے

بتخانۂ جبیں میں سجدے مچل رہے ہیں
کافر ادا صنم ہے، کافر بنا رہی ہے

ساری فضا پہ طاری ہے اک غبارِ ماتم
گویا تمام وادی آنسو بہا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اب نغمے سو گئے ہیں، باجہ بھی تھک گیا ہے
محشر اُٹھا چکی ہے، فتنے جگا رہی ہے

ایسی دبی صدا ہے، گویا عروسِ نغمہ
مُنہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہے

کچھ کھُل گیا ہے جیسے بادل کوئی برس کر
یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہے

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں
جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے

پھولوں سے اب تک اس کے نغمے اُبل رہے ہیں
پتوں سے اب تک اُس کی آواز آ رہی ہے

اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں
اب تک وہی تجلّی آنکھوں پہ چھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

کلیاں

نہ پھولوں کی تمنا ہے نہ گلدستوں کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

ابھی ٹوٹا نہیں سورج کی کرنوں سے حجاب اِن کا
ابھی رسوا نہیں ہے گلفروشوں میں شباب اِن کا

ہوا میں جھولتے رہتے ہیں ہر دم آشیاں ان کے
ہیں دو دو پتیوں کی گود میں قائم مکاں ان کے
خزاں جن کو چرا کر لے گئی تھی اک زمانے میں
صبا لے آئی پھر، موتی وہ گلشن کے خزانے میں
یہ گہری چاندنی میں جھومتی ہیں شاخساروں پہ
کہ کچھ چینی کی گڑیاں ناچتی ہیں سبز تاروں پہ

کوئی دوشیزہ جب آغوشِ بیماری میں سوتی ہے
تو صحت سے کہیں بڑھ کر حسیں معلوم ہوتی ہے
یونہی پھولوں میں اور کلیوں میں بھی فرق لطافت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

کوئی چھوئے اگر ان کو تو یہ کمہلا کے رہ جائیں
حیا میں اس قدر ڈوبی ہیں کہ بس مرجھا کے رہ جائیں
یہ جب تک یوں اچھوتی رہتی ہیں بیدار رہتی ہیں
یونہی مدہوش رہتی ہیں یوں ہی سرشار رہتی ہیں
مرا بس ہو تو اختر میں انہی کا رنگ ہو جاؤں
ہمیشہ کے لئے ان چمپئی پردوں میں سو جاؤں

برکھا رُت

آسماں پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم — نوبہاروں کا ہجوم
آہ یہ رنگین آوارہ نظاروں کا ہجوم — کوہساروں کا ہجوم
پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اس طرح — اور ہوائیں اس طرح
جھومتا پھرتا ہے جیسے میگساروں کا ہجوم — بادہ خواروں کا ہجوم
نیلگوں پریاں اُفق میں پر ہیں پھیلائے ہوئے — بال بکھرائے ہوئے
یا اُمنڈ آیا ہے ساون کی بہاروں کا ہجوم — ابر پاروں کا ہجوم
بجلی ہے یا نُور کی زنجیر لہرائی ہوئی — پیچ و خم کھائی ہوئی
یا خمیدہ مرمریں پھولوں کے ہاروں کا ہجوم — اور ستاروں کا ہجوم
آہ یہ مخمور آنکھیں، مست سی، بیخواب سی — نیند میں بیتاب سی
جن سے چھلکا پڑ رہا ہے حشر پاروں کا ہجوم — فتنہ زاروں کا ہجوم

آج کی رات

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات — کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات — کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

کیوں نہ گلزار میں اٹھلاتی پھرے موجِ نسیم — کیوں نہ ہر پھول ہو لبریز بہارِ تسنیم
کیوں نہ آمادۂ افلاک ہو پرِ [illegible] شمیم — کیوں نہ ہر ذرہ بنے جلوہ گہہ طورِ کلیم
کہ انھیں دیکھیں گے ہم جلوہ نما آج کی رات

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی — دور سے ہم پہ دل اپنا جو فدا کرتی تھی
دادِ اشعار جو "گم نام" دیا کرتی تھی — ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات

جس کی رنگینی سے افکار ہیں مدہوش مرے — جس کی الفت سے ہیں اشعار پُر از جوش مرے
جس کی فرقت میں خیالات ہیں غم کوش مرے — جس کے جلووں سے تصور ہیں ہم آغوش مرے
جلوہ دکھلائے گی وہ حور لقا آج کی رات

داستانِ دلِ بیتاب سنائیں گے انھیں — آپ روئیں گے، گلے مل کے رلائیں گے انھیں
خود ہی پھر روتے پہ ہنس دیں گے ہنسائیں گے انھیں — اور جرأت کی تو سینے سے لگائیں گے انھیں
نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے ان کو — غمِ الفت سے خبردار کریں گے ان کو
محرمِ جذبۂ اسرار کریں گے ان کو — گود میں لیں گے انھیں پیار کریں گے ان کو
دل کی رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا آج کی رات

لیکن اظہارِ خیالات کریں گے کیونکر؟ شرم آتی ہے ملاقات کریں گے کیونکر؟
بات کرنی ہے مگر بات کریں گے کیونکر؟ ختم، یہ خواب کی سی رات کریں گے کیونکر؟
آہ یہ آج کی، یہ خواب نما آج کی رات

اے دل ایسا نہ ہو کچھ بات بنائے نہ بنے حالِ دل جو بھی سُنانا ہے سُنائے نہ بنے
پاس آئیں تو، مگر پاس بٹھائے نہ بنے شرم کے مارے انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

ہم کو کچھ جرأتِ گویائی بھی ہو گی کہ نہیں؟ ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہو گی کہ نہیں؟
شرم سے دور شکیبائی بھی ہو گی کہ نہیں؟ یوسفِ دل سے زلیخائی بھی ہو گی کہ نہیں؟
آج کی رات اُف او میرے خدا! آج کی رات

انگوٹھی

چھپاؤں کیوں نہ دل میں خاتم گوہر نگار اُس کی
یہی لے دے کے میرے پاس ہے اک یادگار اُس کی

یہی لے دے کے میرے ہاتھ میں ہر وقت رہتی ہے
اور اس کے دستِ رنگین کے افسانے مجھ سے کہتی ہے

طلائی انگلیوں کا جب مجھے قصہ سُناتی ہے
تصور میں ستاروں کے سے پیکر کھینچ لاتی ہے

اسے معلوم ہے وہ کس طرح مغموم رہتی تھی

کسی کے غم میں لُطفِ زیست سے محروم رہتی تھی
مرا خط پڑھ کے وہ کس ناز سے مسرور ہوتی تھی
پھر اپنی بے بسی پر کس طرح رنجور ہوتی تھی

اسے معلوم ہے جو درد تھا اُس پاک سینے میں
بسی ہیں اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے نگینے میں
جہاں سلمٰی کے اور میرے سوا ہوتا نہیں کوئی
انگوٹھی کھوئی جاتی ہے مگر کھوتا نہیں کوئی

مجھے بد دُعا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے
میں بے وفا سہی مجھے دادِ وفا نہ دے
میری خطا کو اپنے کرم سے صلا نہ دے
اقرار ہے مجھے کہ گنہگار ہوں ترا
مجرم ہوں بے وفا ہوں خطاوار ہوں ترا
لیکن تو رحم کر مجھے ایسی سزا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے
یہ کیا کہا " خدا کرے تیرا بھی آئے دل
میری ہی طرح تیرا بھی کوئی دکھائے دل

تیرے غموں پہ کیوں مری اب تک نظر نہ تھی؟
کیا ہو گیا تھا مجھ کو مجھے خود خبر نہ تھی؟
اس بے خودی کی مجھ کو خدارا سزا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

گو آسماں نے تجھ سے جُدا کر دیا مجھے
بیگانۂ خیالِ وفا کر دیا مجھے
کالج کے مشغلوں نے ترا غم بھلا دیا
پردیس کی فضا نے وہ عالم بھلا دیا
پردیسیوں کو دل سے مگر تو بھلا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

مدت سے خط لکھا نہ تجھے یاد ہی رکھا
تیری ہر اک اُمید کو ناشاد ہی رکھا
اپنے کئے پہ آپ ہی پچھتا رہا ہوں میں
تیری نگاہِ درد سے شرما رہا ہوں میں
دل سے بھلا دے، اپنی نظر سے گرا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

گزرے ہوئے دنوں کا خیال آ رہا ہے پھر
آنکھوں کے آگے عہدِ وصال آ رہا ہے پھر
بیتی ہوئی بہار کی راتوں کو یاد کر

اُن بھولی بھالی پیار کی باتوں کو یاد کر

ماضی کا واسطہ انھیں دل سے مٹا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

ڈرتا ہوں، کانپتا ہوں، تری بددعا سے میں

رحمت کی بھیک مانگ رہا ہوں خدا سے میں

یوں بددعا نہ دے، مجھے پھر خدا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

رباعی

موسم بھی ہے، عمر بھی، شباب بھی ہے

پہلو میں وہ رشکِ ماہتاب بھی ہے

دنیا میں اب اور چاہئے کیا مجھ کو

ساقی بھی ہے، ساز بھی، شراب بھی ہے

معصومیت

لیلئ شب کے پریشاں ہیں گیسوئے سیاہ
شورشِ آبادِ جہاں تیرہ و تار
نشہ برساتی ہے مدہوش ستاروں کی نگاہ
نیند میں غرق ہے سارا سنسار
چار سو چھا گئی خاموشی و ظلمت کی سپاہ
نور و آہنگ نے لی راہِ فرار
نیند کی سیج سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ
شیرِ خونخوار ہو جیسے بیدار

○

چار سُو موجزن اک حشرِ سیہ کاری ہے
تند، ہنگامہ فگن طوفانی
بزمِ انسانی پہ اک ابرِ گنہ طاری ہے
تیرگوں شعلہ فشاں ہیجانی
ہر طرف فسق کا اک سیلِ بلا جاری ہے
شورش انگیز و پُر از طغیانی
محشرستانِ سیہ مستی و سرشاری ہے
مست ہے جلوہ گہِ انسانی

○

یہ سماں دیکھ کے اک حور وہاں آتی ہے
مشکبو زلفوں کو بکھرائے ہوئے
اور نظر اس ہوس آباد پہ دوڑاتی ہے
فرطِ تقدیس سے گھبرائے ہوئے
عالمِ یاس میں مبہوت سی رہ جاتی ہے
اشکِ غم آنکھوں میں چھلکائے ہوئے
چاند کی روشنی اک نشہ سا برساتی ہے
سینۂ صاف پہ لہرائے ہوئے
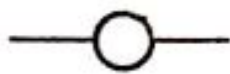
گجرات کی رات

آج قسمت سے نظر آئی ہے گجرات کی رات
کیا بگڑ جائے گا، رہ جائیں یہیں رات کی رات

جس میں سلمیٰ کے تصوّر کے ہیں تارے روشن
میری آنکھوں میں ہے وہ عالمِ جذبات کی رات

میرے سینے پہ ادھر زلفِ معطّر کا ہجوم
آہ وہ زلف کہ آوارہ خرابات کی رات

اُف وہ سوئی ہوئی کھوئی ہوئی فطرت کی بہار
اُف وہ مہکی ہوئی، بہکی ہوئی برسات کی رات

پھر وہ ارمانِ ہم آغوشی کا جذبِ گستاخ
آہ وہ رات وہ سلمیٰ سے ملاقات کی رات

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل، اِس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے

ان نفس پرستوں سے اِس نفس پرستی سے

دُور۔ اور کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

یہ جبر کدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے
ارمانوں کا قاتل ہے امیدوں کا رہزن ہے
جذبات کا قاتل ہے، جذبات کا مدفن ہے

چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی سفاک نگاہوں کی
ظلموں کی جفاؤں کی آہوں کی کراہوں کی

ہیں غم سے حزیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں شاداب نما دنیا

للہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل

اے عشق ہمیں لے چل اک نور کی وادی میں
اک خواب کی دنیا میں اک طور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تا خلدِ بریں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اُس پار اک اِس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پہ تنہائی برستی ہو

یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں

چل اس کے قریں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں

اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے

کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے

رو پہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پہ
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے

سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے

قریبِ شام تمہیں طائرانِ گلشن نے
ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تم کو
نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے

کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لئے
تو آئینے نے تمہیں ہمکنار دیکھا ہے

کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمہیں

سحر نے محوِ گل و شاخسار دیکھا ہے

عروسِ برق نے اپنا نقاب اُلٹ کے تمہیں

غریقِ مستیٔ ابرِ بہار دیکھا ہے

مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے

کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو

دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اعترافِ محبت

مدت سے محبت کرتا تھا سو جان سے تم پر مرتا تھا

راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا

ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا، پر تم سے کہتے ڈرتا تھا

آج اس کی جسارت کرتا ہوں

میں تم سے محبت کرتا ہوں

راتوں کو مرے رونے کا سماں بیدار ستارے دیکھتے ہیں

اور میرے جنوں کے عالم کو، عالم کے نظارے دیکھتے ہیں

باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں، نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں

یوں شرحِ مصیبت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو، زہرہ کی قسم، تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دنیا کی، دُنیا کے نظاروں کی قسم

دنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

جب رات کی بے کس تنہائی میں آپ کو تنہا پاتا ہوں
میں بربطِ دل سے سوز و گداز عشق کے نغمے گاتا ہوں
اتنا تو بتا دو تم بھی مجھے کیا میں بھی کبھی یاد آتا ہوں

بتلاؤ کہ منت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

گر حکم دو روشن تاروں کو میں لا کے جھکا دوں قدموں پہ
جنت کے شگفتہ پھولوں کی جنت سی بسا دوں قدموں پہ
سجدہ گہ مہر و ماہ کو بھی سجدے میں گرا دوں قدموں پہ

ناچیز ہوں ہمت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

آنسو

میرے پہلو میں جو بہ نکلے تمہارے آنسو
بن گئے شامِ محبت کے ستارے آنسو

دیکھ سکتا ہے بھلا کون یہ پیارے آنسو
میری آنکھوں میں نہ آ جائیں تمہارے آنسو

اپنا منہ میرے گریباں میں چھپاتی کیوں ہو؟
دل کی دھڑکن کہیں سُن لیں نہ تمہارے آنسو

مینہ کی بوندوں کی طرح ہو گئے سستے کیوں آج؟
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو

ہجر ابھی دُور ہے میں پاس ہوں اے جانِ وفا
کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمہارے آنسو

صبح دم دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا آنچل
میری چغلی کہیں کھا دیں نہ تمہارے آنسو

صدقے اُس جانِ محبت کے میں اختر جس کے
رات بھر بہتے رہے شوق کے مارے آنسو

بستی کی لڑکیوں میں

(ایک دیہاتی گیت)

سلمیٰ سے دل لگا کر سلمیٰ سے دل لگا کر

اُس حور وش کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر ہوش و حواس کھو کر صبر و سکوں لٹا کر

بیٹھے بٹھائے دل میں غم کی خلش بسا کر

ہر چیز کو بھلا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کہتی ہیں سب یہ کس کی تڑپا گئی ہے صورت

راتوں کو گیت گاتے جب مل کر آتی ہیں سب تالاب کے کنارے دھومیں مچاتی ہیں سب

جنگل کی چاندنی میں منگل مناتی ہیں سب تو میرے اور سلمیٰ کے گیت گاتی ہیں سب

اور ہنستی جاتی ہیں سب

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب اُن چھپے مکاں کو تب راستے میں باہم وہ میری داستاں کو

دہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو

کیا چھیڑے اس بیاں کو

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اس شمع رو کا جب سے پروانہ بن گیا ہوں ۔ بستی کی لڑکیوں میں افسانہ بن گیا ہوں
ہر ماہ وش کے لب کا پیمانہ بن گیا ہوں ۔ دیوانہ ہو رہا ہوں، دیوانہ بن گیا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک پوچھتی ہے آکر تم بیقرار کیوں ہو؟ ۔ کچھ تو ہمیں بتاؤ یوں دلفگار کیوں ہو؟
کیا روگ ہے کہو تو تم اشکبار کیوں ہو؟ ۔ دیوانے کیوں ہوئے ہو، دیوانہ وار کیوں ہو؟
با حال زار کیوں ہو؟
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آکر ۔ دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر
شرما کے مسکرا کر، آنچل سے منہ چھپا کر ۔ جاؤ نا پیچھے پیچھے دو باتیں کر لو جا کر
کھیتوں میں چھپ چھپا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آکر ۔ سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر
"یہ کون ہے" تو ظالم کہتی ہے مسکرا کر ۔ تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جا کر
یہ گیت اُسے سنا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

ایک حُسن فروش سے

محبت آہ تیری یہ محبت رات بھر کی ہے
تری رنگین خلوت کی لطافت رات بھر کی ہے

ترے شاداب ہونٹوں کی عنایت رات بھر کی ہے
ترے مستانہ بوسوں کی حلاوت رات بھر کی ہے

تو کیا جانے کہ سودائے محبت کس کو کہتے ہیں؟
محبت اور محبت کی لطافت کس کو کہتے ہیں؟

غمِ ہجراں ہے کیا اور سوزِ اُلفت کس کو کہتے ہیں؟
جنوں ہوتا ہے کیسا اور وحشت کس کو کہتے ہیں؟
تو کیا جانے ؟ غمِ شب ہائے فرقت کس کو کہتے ہیں؟
ترے اظہارِ اُلفت کی فصاحت رات بھر کی ہے؟

نگاہِ مست سے دل کو مرے تڑپا رہی ہے تو
ادائے شوق سے جذبات کو بھڑکا رہی ہے تو

مجھے بچے کی صورت ناز سے پھسلا رہی ہے تو
کھلونے دے کے بوسوں کے مجھے بہلا رہی ہے تو

مگر نادان ہے تو! آہ دھوکا کھا رہی ہے تو
مجھے معلوم ہے تیری محبت رات بھر کی ہے

ترا روئے درخشاں ہے بظاہر آفتاب آسا

ترے ہونٹوں کی شادابی ہے رنگت میں شراب آسا

ترے رخسار کی مہتابیاں ہیں آفتاب آسا
مگر ان کی حقیقت ہے حباب آسا، سراب آسا

کہ غازے کی صباحت اس پہ چھائی ہے نقاب آسا
اور اس غازے کی بھی جھوٹی صباحت رات بھر کی ہے

لطافت سے ہیں خالی تیرے کملائے ہوئے بوسے
طراوت سے ہیں خالی تیرے مرجھائے ہوئے بوسے

نزاکت سے ہیں خالی تیرے گھبرائے ہوئے بوسے
حقیقت سے ہیں خالی تیرے شرمائے ہوئے بوسے

محبت سے ہیں خالی تیرے گھبرائے ہوئے بوسے
اور ان بوسوں کی یہ جھوٹی حلاوت رات بھر کی ہے

ترے زہریلے بوسے مجھ کو جس دم یاد آئیں گے
مرے ہونٹوں پہ کالے ناگ بن کر تھرتھرائیں گے

پشیمانی کے جذبے مجھ کو دیوانہ بنائیں گے
مرے افکار کو نفرت کے خنجر گدگدائیں گے

مرے دل کی رگوں میں غم کے شعلے تیر جائیں گے
میں سمجھا، آہ سمجھا یہ مسرت رات بھر کی ہے

آہ وہ راتیں

وہ راتیں آہ، جن کی گود میں ہم چھپ کے ملتے تھے
وہ باتیں جن کے پردوں میں دلوں کے تار ہلتے تھے

وہ راتیں، جب محبت کے فسانے جاگ اُٹھتے تھے
ربابِ دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اُٹھتے تھے

کتابِ عاشقی کے جب اُلٹتے تھے ورق ہم تم!
وہ راتیں جن میں بے خوابی کے لیتے تھے سبق ہم تم!

سکون و صبر کھو دیتی تھیں جب تم آہ وہ راتیں
خیالِ غم سے رو دیتی تھیں جب تم آہ وہ راتیں

اگر تم کو یہ بھولی بسری باتیں یاد آ جائیں
اور آغازِ محبت کی وہ راتیں یاد آ جائیں

تو ان راتوں کی رنگیں داستانی کی قسم تم کو
اور اپنی پاک و دوشیزہ جوانی کی قسم تم کو

جو اُن راتوں میں روشن تھے قسم ہے اُن ستاروں کی
جو اُن راتوں میں بکھرے تھے قسم ہے اُن نظاروں کی

محبت کی اُنھی معصوم راتوں کی قسم تم کو
حقیقت کی اُنھی "موہوم" راتوں کی قسم تم کو

قسم اُس پاک بازی کی، جو تھی باہم خیالوں میں

قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
انہی بہکی ہوئی نیچی نگاہوں کی قسم تم کو
انہی کھوئی ہوئی خاموش آہوں کی قسم تم کو

قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبور وحشت تھی
قسم اُس پاک دامانی کی جو مغرور عفت تھی

فقط اتنا بتا دو! کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں! آہ وہ راتیں وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

یور ہائی نس

میں جب کم سن تھا اور تو اپنے سینے سے لگاتی تھی
تری ہنستی ہوئی نظروں سے مجھ کو شرم آتی تھی

مچلتا تھا میں تیری گود میں باہر نکلنے کو
مگر تو اک ادائے مطمئن سے مسکراتی تھی

ترے وہ گیت اب تک گونجتے ہیں میرے کانوں میں
جنھیں میرے لئے لکھتی تھی تو اور گنگناتی تھی

ترا وہ مخملی بستر ابھی تک یاد ہے مجھ کو
مجھے سردی کے ڈر سے جس میں تو اکثر سلاتی تھی

میں سو جاتا تھا جب رنگیں دلائی اوڑھ کر تیری

تو اپنے مرمریں ہاتھوں سے مجھ کو گدگداتی تھی

دماغ اب تک معطر ہے تری مستانہ خوشبو سے

ترے گجرے کی کلیوں کو بھی جو بے خود بناتی تھی

تری رنگیں جوانی نقش ہے اب تک مرے دل پر

جو تیرے پھول سے پیکر کے اندر لہلہاتی تھی

تری وہ محفلیں آباد ہیں اب تک تصور میں

تو جن میں اپنی گڑیا سے مری شادی رچاتی تھی

مگر اے شاہزادی، آج کچھ تجھ کو خبر بھی ہے

کہ وہ کم سن جسے تو اپنے سینے سے لگاتی تھی

وہ شاعر ہے کہ دنیا میں کہانی اُس کی رُسوا ہے

وہ رُسوا اُس کا دل رُسوا، جوانی اُس کی رُسوا ہے

پشیمان آرزو

علاجِ دردِ دلِ بیقرار کر لیتے

تلافیِ غمِ لیل و نہار کر لیتے

ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

یہ کہتے "چاکِ گریباں کو دیکھئے تو سہی"

ہمارے حالِ پریشاں کو دیکھئے تو سہی

اور اس بہانے اُنھیں ہمکنار کر لیتے

اُمیدِ وصل کبھی کامیاب ہو نہ سکی
دعائے نیم شبی مستجاب ہو نہ سکی
کہ دردِ دل سے انھیں بیقرار کر لیتے

ستم ہے اُس بتِ زہرہ جبیں کو کھو بیٹھے
اور اپنی زیست سے ہم نااُمید ہو بیٹھے
اُسی پہ کاش ہم اُس کو نثار کر لیتے

خدائی بھر میں کسی شے کی جستجو ہی نہ تھی
سوائے اس کے کچھ اخترؔ کی آرزو ہی نہ تھی
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

○

اختر ستان

دوسرا مجموعۂ کلام

اخترستان

نشیدِ آغاز

پھر قلم بیتاب ہے موتی لٹانے کے لئے
کہکشاں جھکنے لگی دامن بڑھانے کے لئے

شمعِ دل کرتا ہوں روشن رہ گزارِ عشق پر
سوز و سازِ غم کی ہمت آزمانے کے لئے

دل میں ذوقِ آرزو پھر چٹکیاں لینے لگا
حُسن کی نازک دلی کو گدگدانے کے لئے

میں وہ میکش ہوں کہ گلزارِ جہاں سے صبح و شام
حوریں آتی ہیں مجھے کوثر پلانے کے لئے

میں وہ مجنوں ہوں کہ گر سیرِ جنوں منظور ہو
دشت میں آجائے لیلیٰ خاک اُڑانے کے لئے

میں وہ خسرو ہوں کہ گر چاہوں ثبوتِ عاشقی
مضطرب شیریں ہو جوئے شیر لانے کے لئے

میں وہ یوسف ہوں کہ ہو گر جستجوئے مشتری
آئے خود حُسنِ ازل قیمت لگانے کے لئے

میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے نہاں
مہر و مہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لئے

دل کے کاشانے میں ہیں فانوسِ اشکِ سُرخ کے
آرزو شعلہ ہے شمعِ غم جلانے کے لئے

شعلۂ دل بوئے گل سے ہے طرب انگیز تر
طُور برساتا ہوں جنت کو جلانے کے لئے

موت ہے اک انتظار اور انتظارِ دائمی
کس قدر معصوم دھوکا جی لبھانے کے لئے

یہ نظامِ زندگی ہے نقشِ احساسِ خودی
ذرہ ذرہ مضطرب ہے سر اُٹھانے کے لئے

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی — سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو — وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے، کیا — اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

شاداب شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نوعمر خریدار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں — اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں؟

کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی
اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں
وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر
پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر
سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں؟
اور اپنے گھر کو جاتے ہوئے
ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں
گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں
برکھا کی صدائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں
موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں میلوں میں وہی
برسات کا جوبن ہوتا ہے
پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں
جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے
اُمڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں
چھایا ہوا ساون ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں برسات کے دن   باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟
معصوم و حسیں دوشیزائیں   برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
اور تتریوں کی طرح سے رنگیں   جھولوں پر لہراتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی   وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں   جس میں وہ مثالِ خواب فضا؟
وہ کھیل، وہ ہم سن وہ میداں   وہ خواب گہ مہتاب فضا؟
او دیس سے آنے والے بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی کسی کے سینے میں   باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب   یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا   للہ بتا! للہ بتا!
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب گجر دم چرواہے   ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟
اور شام کے دھندلے سایوں کے   ہمراہ گھروں کو آتے ہیں؟

اور اپنی رسیلی بانسریوں میں عشق کے نغمے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

مرجانہ تھا جس کا نام بتا وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ سروِ چمن وہ رشکِ سمن وہ سیم بدن کس حال میں ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

اب نامِ خدا، ہوگی وہ جواں میکے میں ہے یا سسرال گئی؟
دوشیزہ ہے یا آفت میں اسے کم بخت جوانی ڈال گئی؟
گھر پر ہی رہی یا گھر سے گئی خوش حال رہی خوش حال گئی؟

او دیس سے آنے والے بتا

○

گذری ہوئی راتیں

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا

رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

رُخِ روشن کے جلووں سے سحر کا نور بن بن کر

اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا

محبت کے فرشتے کی طرح خاموش راتوں میں

فضا کو نکہتِ گیسو سے مہکاتے ہوئے آنا

ترے پازیب کی جھنکار کا آہستہ آہستہ

وہ دھیمی دھیمی لے میں گیت برساتے ہوئے آنا

ترے ابریشمی ملبوس کا صرصر کے جھونکوں سے

سحابِ رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا

بدن اپنا چرا لینا کبھی نظریں جھکا لینا

ہم آغوشی کے اندیشے سے گھبراتے ہوئے آنا

نگاہوں میں حیا آنکھوں میں مستی چال میں لغزش

مصور کے قلم کے خواب برساتے ہوئے آنا

محل کے پاسباں خوابیدہ شمعیں خواب در دیدہ

اور اے ملکہ ترے سائے کا شرماتے ہوئے آنا

○

جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی

کنول کا پھول تھی، سنسار سے بیگانہ رہتی تھی

نظر سے دُور مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

انہی صحراؤں میں وہ اپنے گلّے کو چراتی تھی

انہی چشموں پہ وہ ہر روز منہ دھونے کو آتی تھی

انہی ٹیلوں کے دامن میں وہ آزادانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے تلے وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں

یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سناتے ہیں

وہ ان کھنڈروں میں اک دن صورتِ افسانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم، یہ نخلستان اک دن اُس کا مسکن تھا

اسی کے خرمئی آغوش میں اُس کا نشیمن تھا

اِسی شاداب وادی میں وہ بے باکانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اسی ویرانے میں اک دن بہشتیں لہلہاتی تھیں
گھٹائیں گھر کے آتی تھیں، ہوائیں مسکراتی تھیں
کہ وہ بن کر بہارِ جنتِ ویرانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں آباد تھی اک دن مرے افکار کی ملکہ
مرے جذبات کی دیوی مرے اشعار کی ملکہ
وہ ملکہ، جو برنگِ عظمتِ شاہانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

صبا شاخوں میں نخلستاں کی جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
یہیں ریحانہ رہتی تھی، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

فضائیں گونجتی ہیں اب بھی اُن وحشی ترانوں سے
سُنو، آواز سی آتی ہے اُن خاکی چٹانوں سے
کہ جن میں وہ برنگِ نغمۂ بیگانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

بربِّ کعبہ اُس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا
میں اس وادی کے ذرّے ذرّے پر سجدے بچھا دوں گا
جہاں وہ جانِ کعبہ، عظمتِ بتخانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

شمیمِ زلف سے اُس کی مہک جاتی تھی کُل وادی
نگاہِ مست سے اُس کی بہک جاتی تھی کُل وادی
ہوا میں پر فشاں، روحِ مئے و میخانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

گدازِ عشق سے لبریز تھا قلبِ حزیں اُس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا روئے حسیں اُس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اُسے پھولوں نے میری یاد میں بیتاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے رات بھر بے خواب دیکھا ہے
وہ شمعِ حُسن تھی پر صورتِ پروانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

پیامِ دردِ دل اختر دیے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں کیے جاتا ہوں وادی کو
سلام! اے وادیٔ ویراں جہاں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

○

جمالِ سلمیٰ

(مری کی صنوبرستانی راتوں میں)

مری کی ہر سبز پوش وادی ہواؤں سے تھرتھرا رہی ہے
صنوبرستاں کے دامنوں میں نسیم بربط بجا رہی ہے
شمیم گُل موجِ بیخودی بن کے روح کو گدگدا رہی ہے
مگر مرے دل کی دھڑکنوں سے صدا یہ رہ رہ کے آ رہی ہے

"احق شوقاً" الیٰ دیارِ لقیتُ فیہا جمالِ سلمیٰ
کہ می رساند ازاں نواحی نوید وصلے بجانب ما"

اُن سے

دلِ غم دیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی
چشمِ محزوں میں لہو رونے کی عادت نہ رہی
مرنے کے دن نہیں اور جینے کی حسرت نہ رہی
رحم کر رحم کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی

دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے
تیرے قربان ترا عشق نہ رُسوا ہو جائے

عشق نے ظلم وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
یاس نے گل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے
درد دکھ دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
ہم نے وہ رنج اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اشک پروردہ ہیں غم دیدہ ہیں مجبور ہیں ہم
او پری! پاس بلا لے کہ بہت دُور ہیں ہم

جانتا ہوں کہ نہیں بھی ہے محبّت مجھ سے　　گر یہ سچ ہے تو سُنو ایک شکایت مجھ سے
پہلے تو رکھتی تھیں تم خط و کتابت مجھ سے　　کہتی سُنتی تھیں ہم قصّۂ اُلفت مجھ سے

پھول کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے
دیکھ کر جن کو کنول روح کے کھِل جاتے تھے

اب مگر مدتیں گذریں کہ وہ حالت نہ رہی　　وہ نوازش وہ مروّت وہ عنایت نہ رہی
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبّت نہ رہی　　ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی

تم ہو اب اور مدارات ہے بیگانوں کی
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر　　اجنبیت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر
نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبّت کا اثر　　آخر اِس طرزِ تخاطب سے ہے کیا مدّ نظر

کیا یہ مطلب ہے کہ میں لائقِ اُلفت نہ رہا
دل مرا درخورِ غمہائے محبّت نہ رہا

پھر نہ کہنا کہ عبث کر دیا بدنام ہمیں　　پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں
یا یہ حیلہ کہ نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں　　آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں

دیکھ لینا یہ بہانے نہیں کام آئیں گے
تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے

میرے انجام پہ پچھتاؤ گی تم، یاد رہے　　اپنے اس ظلم سے شرماؤ گی تم، یاد رہے
اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم، یاد رہے　　حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم، یاد رہے
"رفتم از دستِ تو اے غارتگرِ ایماں رفتم　　نہ ہوایم نہ شتابی کہ شتاباں رفتم"

شاعر کی تربت

دامانِ خرابہ زار میں ہے — اک شاعرِ نوجواں کی تربت
یا وادیٔ نوبہار میں ہے — اک نکہتِ رائگاں کی تربت

آتی نہیں اس طرف ہوائیں — شاداب و شگفتہ پھول لے کر
زائر نہیں اشک جو بہائیں — سینے میں دلِ ملول لے کر

شاعر کو مگر نہیں خبر کچھ — وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اُس پہ نہیں حال کا اثر کچھ — جاگا تھا غریب سو رہا ہے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ نکھرے ہوئے تارے — خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے
یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں میں پری خانے ہیں روشن — یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

ساحل ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی مستانہ بہاروں کے شبستاں
اختر کی تمنا ہے یہیں رات گزارے

سلمیٰ (نور جہاں کے مزار پر)

فضائے غم میں محبت سی جھلملائی ہے　　خزاں کی شام پہ صبح بہار آئی ہے
مزارِ نور جہاں پر وہ شوخ آئی ہے

گماں ہے خلد سے حورِ جناں نکل آئی　　نقابِ گل سے شمیمِ نہاں نکل آئی
کہ اپنی قبر سے نور جہاں نکل آئی

طلائی ہاتھ اٹھے کس کے فاتحہ کے لئے　　فضائیں ہو گئیں بیتاب التجا کے لئے
خدائی کانپ اٹھی جذبۂ دعا کے لئے

گداز دل میں جنوں سر میں لب پہ شیون بھی　　وہ شیون آہ کہ رو دے وہ چشمِ پرفن بھی
مگر میں کیا کروں ہے ساتھ شیر افگن بھی؟

الٰہی گر اسے نورِ جہاں بنانا تھا　　مرے نصیب کو یوں کامراں بنانا تھا
مجھے بھی خسروِ ہندوستاں بنانا تھا

کہ ایک دن یہی نورِ جہاں مری ہوتی　　جو آج غیر کی ہے دلستاں مری ہوتی
یہ غمزدہ بدلِ شادماں مری ہوتی

اُٹھی ہیں قبر پہ کس کی یہ سوگوار آنکھیں　　کہ ذرّے ذرّے کی ہیں غم سے بیقرار آنکھیں
فضا میں کچھ نہیں باقی پر اشکبار آنکھیں

شعاعِ ماہِ جواں کو فگار دیکھا ہے　　شمیم خلد کو ماتم گسار دیکھا ہے
کسی نے حسن کو یوں سوگوار دیکھا ہے؟

وقت کی قدر

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمٰی　　چمن کی گود میں آ کر سما بھی جا سلمٰی
کلی کلی میں بہاریں بسا بھی جا سلمٰی　　مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمٰی
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمٰی

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں　　فضائے روضۂ جنت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں　　کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمٰی
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمٰی

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں　　نظر نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں　　فضا میں خواب حسیں بن کے چھا بھی جا سلمٰی

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں یہ نکہتیں یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ مستیاں یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں خدائی ہو کہ خدا ہو بھلائے بیٹھے ہیں
سرورِ عہدِ جوانی لٹائے بیٹھے ہیں تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئیں گی پھر یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ ہلکی ہلکی پھواریں نظر نہ آئیں گی پھر شرابِ عشق و مسرت لنڈھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دی ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج
اجل پہ بھی مری ہستی کو اختیار ہے آج غرورِ عشق کی ہمت بڑھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

اِنتظار

بہارِ کیف کی بدلی اُتر آئے گی وادی میں
سرورِ رو نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرشِ گُل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دیں مستیاں پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بہارِ وادیٔ رنگیں کو یہ مژدہ سنا آؤں
زمیں کو نکہتِ گلہائے رعنا سے بسا آؤں
اور اس پہ نازنیں کلیوں کا اک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے اور تھک جائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

مرے آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے کاکلِ مشکیں وہ مُوئے نازنیں اُس کا

وہ رخسارِ حسیں اُس کے وہ جسن یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

تمنّا و حیا کی کشمکش کیونکر مٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اس کے لعلِ لب سے کس طرح رنگت چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر ، پیاری چلی جاؤ گی کیا!
میری نگاہِ شوق کو فرقت میں ترساؤ گی کیا ؟
اُف حشر تک یہ چاند سی صورت نہ دکھلاؤ گی کیا ؟
اور پھر نہیں آؤ گی کیا ؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

کیا سُن رہا ہوں آہ میں دشمن کے گھر جاؤ گی تم
اور اس قفس سے پھر رہا ہونے نہیں پاؤ گی تم
میری تسلّی کے لئے واپس نہیں آؤ گی تم
سچ مچ نہیں آؤ گی کیا ؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

کیا یہ وفا ہے، بیوفا، ایسی وفا ہوتی ہے کیا؟
دنیا میں رسم وعدہ اب یوں ادا ہوتی ہے کیا؟
یہ ہے وفا تو وہ جو اک شے ہے وفا ہوتی ہے کیا؟

دل میں نہ شرماؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

تم جس کی قسمت میں ہو وہ فرخندہ اختر کون ہے؟
کہہ دو تمہارے عشق میں وہ میرا ہمسر کون ہے؟
وہ میرا دشمن لیکن اب میرا مقدر کون ہے؟

مجھ کو نہ بتلاؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

تم سے گلہ، لیکن نہیں، اصلاً نہیں، حاشا نہیں
مجبور ہو، مجبور سے کچھ جبر کا شکوہ نہیں
لیکن کروں کیا، دل کو بھی تو ضبط کا یارا نہیں

کہہ دو کہ پھر آؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

اسلام کا شکوہ

(مسلمانوں سے)

اے مسلماں تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
وہ حمیت وہ دلیری وہ شجاعت کیا ہوئی

کفرزارِ ہند کا تجھ پہ اثر کیوں ہو گیا؟
وہ عرب والوں کی اسلامی صداقت کیا ہوئی

جس کی کیفیت میں گم تھی رُوحِ سلمانؓ و بلالؓ
بادۂ عرفاں کی وہ مستانہ لذت کیا ہوئی

صفحۂ تاریخ پر جو آج تک تابندہ ہے
آج تیری وہ تحیّر خیز شوکت کیا ہوئی

اُٹھ رہا کر دل کو خوابِ عیش کی زنجیر سے
گونج اُٹھیں پھر فضائیں نعرۂ تکبیر سے

ایڈیٹر کی شان میں

قلم ہے ہاتھ میں سگرٹ ہے منہ میں، تن کے بیٹھے ہیں
صحافیات کی کرسی پہ یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

متانت، لاکھ مصنوعی ہو لیکن شبہ ہوتا ہے
وزیرِ ہند وائٹ ہال میں لندن کے بیٹھے ہیں

بس اب انگریزی اخباروں کی شامت آنے والی ہے
کہ قینچی ہاتھ میں ہے بل جبیں پر تن کے بیٹھے ہیں

اکڑفوں اُن کی کہتی ہے بنالو کارٹون آکر
کہ ہم بن کر بھتیجے قیصرِ جرمن کے بیٹھے ہیں
اگر قومی مصائب کا بیاں چھیڑیں مجالس میں
تو شک ہو روضہ خواں کوئی کسی مدفن پہ بیٹھے ہیں
غرور آمیز نظریں پڑتی ہیں پبلک پہ یوں گویا
کلینر این ڈبلیو آر کے انجن کے بیٹھے ہیں
عرب ہوٹل کا خشکہ "ختم ہوجانے کو ہے بالکل
کہ چمچہ ہاتھ میں ہے منہ کھلائے تن کے بیٹھے ہیں

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

تجھے مصرِ جمال و ناز کی اک ساحرہ کہئے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کا فرہ کہئے
ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے

عورت

(فنونِ لطیفہ کی دُنیا میں)

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مغنی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے
نقوشِ آب و گِل میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہے
غرض جب تک یہ دُنیا اور اس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگی بھر ہم پہ عورت کی خدائی ہے

نوائے غیب

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے
کوئی کرنوں کے بربط پر سُنہری گیت گاتا ہے

اور اپنے گیت سے خوابیدہ دنیا کو جگاتا ہے

فضاؤں میں بہارِ کیف و نکہت مسکراتی ہے

خدائی سلسبیلِ بےخودی میں ڈوب جاتی ہے

یہ نغمہ روح کے پردوں کو جا کر گدگداتا ہے

اور اپنی مست لے میں یہ سندیسہ لے کر آتا ہے

کہ فطرت اپنے شعرستان میں مجھ کو بلاتی ہے

یہ کس کی لے چھپی ہے بربطِ انجم کے تاروں میں

یہ کس کے جلوے مضطر ہیں قمر کے آبگینے میں

یہ کون آ کر سمایا جا رہا ہے میرے سینے میں

○

لالۂ طور

تیسرا مجموعۂ کلام

تیسرا مجموعۂ کلام

لالۂ طور

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی، آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا، ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں رو رو کے دعائیں کرتے ہیں
آنکھوں میں تصور دل میں خلش سر دھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں

اے عشق یہ کیسا روگ لگا جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں

یہ ظلم تو اے جلّاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ روگ لگا ہے جب سے ہمیں، رنجیدہ ہوں میں بیمار ہے وہ
ہر وقت تپش، ہر وقت خلش، بیخواب ہوں میں بیدار ہے وہ
جینے سے ادھر بیزار ہوں میں، مرنے پہ اُدھر تیار ہے وہ

اور ضبط کہے فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

بیدرد! ذرا انصاف تو کر، اس عمر میں اور مغموم ہے وہ
پھولوں کی طرح نازک ہے ابھی تاروں کی طرح معصوم ہے وہ
یہ حسن ستم! یہ رنج غضب! مجبور ہوں میں مظلوم ہے وہ

مظلوم پہ یوں بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق خدارا دیکھ کہیں، وہ شوخ حزیں بدنام نہ ہو
وہ ماہِ لقا بدنام نہ ہو، وہ زہرہ جبیں بدنام نہ ہو
ناموس کا اس کے پاس رہے، وہ پردہ نشیں بدنام نہ ہو

اس پردہ نشیں کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

امید کی جھوٹی جنت کے، رہ رہ کے نہ دکھلا خواب ہمیں

آئندہ کے فرضی عشرت کے وعدے سے نہ کر بیتاب ہمیں
کہتا ہے زمانہ جس کو خوشی، آتی ہے نظر کمیاب ہمیں

چھوڑ ایسی خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ دن ہی میں عہد طفلی کے، معصوم زمانے بھول گئے
آنکھوں سے وہ خوشیاں مٹ سی گئیں، لب کو وہ ترانے بھول گئے
اُن پاک بہشتی خوابوں کے، دلچسپ فسانے بھول گئے

ان خوابوں سے یوں آزاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذب نہاں پر رو دینا
آہنگِ طرب پر جُھک جانا آوازِ فغاں پر رو دینا
بربط کی صدا پر رو دینا، مطرب کے بیاں پر رو دینا

احساس کو غم بنیاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جی چاہتا ہے اک دوسرے کو یوں آٹھ پہر ہم یاد کریں
آنکھوں میں بسائیں خوابوں کو اور دل میں خیال آباد کریں
خلوت میں بھی ہو جلوت کا سماں وحدت کو دوئی سے شاد کریں

یہ آرزوئیں ایجاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامۂ گیر و دار اُٹھا
دُنیائے سکوں کے پہلو سے پھر فتنۂ حشر آثار اُٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پہ، پھر ابرِ شرارہ بار اُٹھا

بیکار ہیں چنگ و تار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر طبلِ وغا کا شور ہوا، آفاق کے ایواں کانپ اُٹھے
پھر باغ و گلستاں کانپ اُٹھے پھر دشت و خیاباں کانپ اُٹھے
صحرا و قہستاں کانپ اُٹھے دریا و بیاباں کانپ اُٹھے

آوازۂ گیر و دار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں
طیاروں کی آتش بازی سے ہاموں و کہتاں گونجتے ہیں
دریاؤں کی تہ میں موتوں کے بپھرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں

یا دیوِ شرارہ خوار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے بادِ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی، جاں میری فدائے آزادی

اُٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

وہ ہلہلہ یلغار اُٹھا

اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں رہنے دے مئے گلفام نہ دے

تلوار اُٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے

صہبا کی جگہ رقصاں ہے لہو مستی کا فریب خام نہ دے

یہ جام مئے گلنار اُٹھا

اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر چشم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں

شاداب ہوا کرتی ہے سدا ہر قوم کی عظمت میداں میں

تلواروں کی خونی بارش سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں

گھنگھورئے طرب کا ہار اُٹھا

اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

خاموش کر اپنے بربط کو خوابوں کا اثر ہر تار میں ہے

وہ لطف کہاں اس ساز میں جو تلوار کی اک جھنکار میں ہے

ہنگامۂ قتل و غارت کا ارمان دل سرشار میں ہے

یہ بربط راحت بار اُٹھا

اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

نذرِ وطن

نذرِ وطن پھر اے دلِ دیوانہ چاہیئے
پھر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

پھر سرزمیں وطن کی ہے نظروں کے سامنے
پھر لب پہ ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے

پھر جا رہے ہیں مے کدۂ حسن کی طرف
پھر ہر قدم پہ لغزشِ مستانہ چاہیئے

مدت کے بعد سامنے ہوگی وہ شمع رو
پھر دل کو سوزشِ پرِ پروانہ چاہیئے

پھر شوق سے ملیں گے کسی گلعذار سے
پھر لب پہ شورِ بلبلِ مستانہ چاہیئے

جھولا جھلائیں گے کسی مستِ شباب کو
رقصاں فضا میں پھر مے و میخانہ چاہیئے

پھر چاندنی میں دامنِ دریا پہ اے ندیم
رقصِ شراب و گردشِ پیمانہ چاہیئے

اختر وطن میں آ کے کھلا یہ حسین راز
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ چاہیئے

میرا موجودہ مشغلہ

زبانِ خامہ سے پھر گل کھلانے کی تمنا ہے
کہ اک گلرخ نے پوچھا ہے تمہارا شغل اب کیا ہے

پریشاں حالیاں، اس پرسشِ احوال کے قرباں
مرا ہر شعر، اس کی زلف کے ہر بال کے قرباں

مری چشمِ حزیں اس دلربا تحریر کے صدقے

دلِ دیوانہ اس مشکیں ادا زنجیر کے صدقے

حسیں الفاظ میں جذبوں کا اک طوفاں پنہاں ہے
اثر سے جس کے دل میں بجلیوں کا جوش رقصاں ہے

دلِ مضطر کو ارماں ہے مچل کر خامہ بن جائے
تمنا کو یہ حسرت ہے اُبل کر نامہ بن جائے

جنونِ بے خودی بس کر کہ عرضِ داستاں کر لوں
حضورِ حسن میں کچھ مشغلہ اپنا بیاں کر لوں

ادب سے جا کے کہنا اے صبا اس شوخِ پُرفن سے
کہ روماں اور محبت، مشغلہ ہے میرا بچپن سے

محبت کے لئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں

ہر اک شاعر، مقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے
محبت کا جنوں، تنہا مرے حصے میں آیا ہے

محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے بقا میری فنا میری

محبت ہی مرے نزدیک معراجِ عبادت ہے
محبت ہی مرے نزدیک سرتاجِ عبادت ہے

محبت میری دولت ہے محبت میری عظمت ہے
محبت ہی سے مصرِ شعر پہ میری حکومت ہے

محبت ہی سے روشن جلوۂ زارِ کبریائی ہے
محبت جس کو کہتے ہیں حقیقت میں خدائی ہے

شب و روز اک نیا پیغام لاتے ہیں محبت کا
گل و انجم، مجھے نغمہ سُناتے ہیں محبت کا

سحر کی حور، جب زلفِ سمن پر گنگناتی ہے
محبت رنگ و بو ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے

عروسِ شام شرماتی ہے جب دن کے نظاروں سے
محبت نیچی نظریں بن کے گرتی ہے ستاروں سے

وداعِ شب، اُٹھاتا ہے پائیں باغ میں مجھ کو
ستارہ صبح کا پاتا ہے پائیں باغ میں مجھکو

سحر خیزی، مری پھولوں کو بیداری سکھاتی ہے
مری آمد نواسنجانِ گلشن کو جگاتی ہے

اور اس کے بعد میں ہوتا ہوں اور وجدان کا عالم
محبت شاعری، احساس اور ہیجان کا عالم

ہجومِ گُل میں کھو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
مری معبود ہو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں

چمن کے مست نظارے مجھے مسرور رکھتے ہیں
مرے دل کو گدازِ نغمہ سے معمور رکھتے ہیں

شراب رنگ و بو ایسی برستی ہے نظاروں سے

لپٹ جاتا ہوں جوشِ بیخودی میں شاخساروں سے

اسی عالم میں یاد آتی ہیں کچھ بیتی ہوئی راتیں
جوانی کی بہاروں کا لہو بیتی ہوئی راتیں

کہانی سی کوئی دہراتی ہیں یہ چاندنی راتیں
کہاں سے جا کے پھر لوٹ آتی ہیں یہ چاندنی راتیں

وہی ہیں چاند تارے اب بھی اور ویسی ہی رات اب بھی
مرا بچپن نہیں باقی وہی ہے کائنات اب بھی

مجھے جب یادِ ماضی، حال سے بیزار کرتی ہے
تو مستقبل کی امید آ کے دل کو پیار کرتی ہے

میں کھو جاتا ہوں آئندہ مسرت کے خیالوں میں
خوشی کا رنگ بھر دیتا ہوں ماضی کے ملالوں میں

مرا دل ڈوبنے لگتا ہے اِس انبارِ ارماں سے
یہ کشتی تہ نشیں ہو جاتی ہے ٹکرا کے طوفاں سے

غرض کیا پوچھتے ہو مشغلہ الفت کے ماروں سے
یہ وحشی کھیلتے رہتے ہیں پھولوں سے بہاروں سے

گلبانگِ قفس

مدت سے نہ آئی کوئی خبر یارانِ گلستاں کیسے ہیں
اے بادِ صبا اتنا تو بتا سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں

پابندِ قفس تو کیسے ہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں، اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟
ہمدرد ہے اپنا کون یہاں، لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اِس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟
غربت ہی نہ تھی کم ہوش ربا، اُس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آکے ذرا، ہم خستہ حزاں کیسے ہیں؟
اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن، خوش باش، سُنا پھر حالِ وطن
کہسار و دمن کس حال میں ہیں وادی و خیاباں کیسے ہیں؟
گلبانگِ قفس ہی بن جائے، اے کاش نوائے آزادی
کیا کہئے کہ اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں؟

آمدِ بہار

حسین چہروں پہ اب پسینے سے غازہ کم چھوٹنے لگا ہے
سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں پھر شگفتگی سی مچل رہی ہے
بہار آنے لگی ہے راتوں پہ کیف بن بن کے رفتہ رفتہ
برنگِ مہتاب، حورِ فطرت ادا سے رنگت بدل رہی ہے
صبا جب آتی ہے گلستاں سے، شبِ بہاراں کے کمکشاں سے
یہی گماں ہوتا ہے جناں سے، پریٔ فطرت نکل رہی ہے

یہ مست و مخمور رات اختر، یہ جانفزا کائنات اختر
اُدھر نظارے لٹا رہی ہے اُدھر ستارے اُگل رہی ہے

میداں کی آرزو

گل کی ہے آرزو نہ گلستاں کی آرزو
سینے میں حشر خیز ہے میداں کی آرزو
مردوں کو مطربِ دمے و مینا سے کام کیا
ہے تیر و تیغ و خنجرِ بُرّاں کی آرزو
کم ہمتوں سے کہہ دو کہ آئیں نہ میرے ساتھ
ہے مجھ کو جنگِ رستمِ دستاں کی آرزو

ہو سیلِ میکدہ کا اثر ہم پہ کیا مجال
لرزاں ہے دل میں خون کے طوفاں کی آرزو

بڑھے چلو

(ایک جنگی ترانہ)

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو
یلانِ زلزلہ فگن بڑھے چلو، بڑھے چلو
غضنفرانِ پیل تن بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

رُکو نہیں، جو دشت و ریگ زار آئیں سامنے
بچو نہیں، جو سیل و جوئبار آئیں سامنے
ہٹو نہیں، جو بحر و کوہسار آئیں سامنے
ہو راہ کتنی ہی کٹھن بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

بڑھو کہ ڈھل چلا ہے دن قریبِ وقتِ شام ہے
افق کے دستِ زرد میں شفق کا سُرخ جام ہے
سوادِ غرب کو رواں مہر تیز گام ہے
بڑھی شعاعِ ضو فگن، بڑھے چلو بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو

تمہاری تیغ تیز پہ وطن کو افتخار ہے
وطن کی مرگ و زیست کا تمہیں پہ انحصار ہے
تمہیں ہو جن کے دل میں اس کا عشق بیقرار ہے
لگائے دل میں اک لگن بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

اُٹھاؤ تیغ بے اماں، وطن کے پاک نام پہ
لٹا دو عمرِ نوجواں وطن کے پاک نام پہ
نثار کر دو اپنی جاں وطن کے پاک نام پہ
صدائیں دیتا ہے وطن بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو بڑھے چلو

بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

تمہارے نعروں سے سوادِ کارزار کانپ اُٹھے
فضائے دشت تھرتھرائے کوہسار کانپ اُٹھے
ہر ایک قلعہ گونج اُٹھے ہر اک حصار کانپ اُٹھے
مثالِ بحرِ جوش زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

سپاہیانہ زندگی جو قسمتِ سعید ہے
تو رزمگہ کی موت بھی سپاہیانہ عید ہے
جیا تو فخرِ قوم ہے مرا تو وہ شہید ہے
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

برکھا رُت

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں، اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہوائیں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مسکرا رہی ہیں
نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں

کہ ساری دُنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہارہی ہیں

ننھا قاصد

ترا ننھا سا قاصد، جو ترے خط لے کر آتا تھا
نہ تھا معلوم اُسے کس طرح کے پیغام لاتا تھا؟
سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں؟
حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں؟
اُسے کیا علم ان رنگیں فضاؤں میں چھپا کیا ہے؟
کسی مہوش کا ان کے بھیجنے سے مدعا کیا ہے؟
مگر مجھ کو خیال آتا تھا، اکثر اُس زمانے میں
کہ اُس کی حیرتِ طفلی ہے کیوں گم اس فسانے میں؟
وہ باایں کمسنی، کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہوگا؟
کہ باجی نے ہماری اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا؟
اور آخر وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہیں
کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہیں؟

وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہیں؟
لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہیں؟

پھر ایسے اجنبی پر اُس کی باجی مہرباں کیوں ہیں؟
اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں؟

اور اُس کے شبہے کی اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے
چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے

یہ نوخیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے؟
جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے

عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا
جب اُس سے پوچھتا ہے، وہ اُسے سمجھا نہیں سکتا

کھلونے دے کر اُس کو، مُسکرا دیتا ہے وہ اکثر
اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر

ترے قاصد کے یہ افکار، دل کو گدگداتے تھے
اور اپنے بھولپن سے میرے جذبوں کو مناتے تھے

مگر آج اس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ حسیں میں نے
کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبت کی جبیں میں نے

وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو
زمانے کے تغیّر نے پریشاں کر دیا مجھ کو

ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا

کہ اس پردے کے اندر تیرا رازِ عشق عریاں تھا

ایک پیغام

جو چھیڑتی تھی تمہاری طلائی زلفوں کو — وہی شریر صبا تم کو یاد کرتی ہے
چمن میں سر کو اُٹھائے شجر ہیں چشم براہ — افق پہ مست گھٹا تم کو یاد کرتی ہے
تمہاری اوڑھنی بچپن میں ہو گئی تھی جو گم — وہ آج بن کے گھٹا تم کو یاد کرتی ہے
گزار دیتے تھے ہم جس کی گود میں راتیں — وہ چاندنی، وہ ضیا تم کو یاد کرتی ہے

ہے جس کی آرزو اختر کو مدتوں سے مگر
ہوئی نہیں جو "خطا" تم کو یاد کرتی ہے

فریبِ ہستی

زندگی گزراں، عمرِ رواں کچھ بھی نہیں — ساقیا جام! کہ بنیادِ جہاں کچھ بھی نہیں
اعتبارات پہ قائم ہے نظامِ ہستی — یہ زمیں کچھ بھی نہیں دورِ جہاں کچھ بھی نہیں
ایک اُمیدِ خیالی پہ جیئے جاتے ہیں — ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
لالہ و یاسمن و گل ہیں بہاروں کا فریب — سبزہ و گلکدہ و جوئے رواں کچھ بھی نہیں

حسنِ نو کچھ بھی نہیں، عشقِ جواں کچھ بھی نہیں
ہوش اے دل کہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

زندگی ہی میں جو حاصل نہ ہو وہ کیا نعمت وادی و کوثر و گلزارِ جناں کچھ بھی نہیں
رات دن کشمکشِ رنج والم ہے برپا جان ہی کو نہ ہو راحت تو جہاں کچھ بھی نہیں

کوئی شاداب حقیقت ہے تو ہے بزمِ مغاں
ورنہ اختر یہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

طلوعِ محبّت سے پہلے

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ زمیں سادہ تھی جنت نہ ہوئی تھی پیدا
زندگی میں کوئی لذّت نہ ہوئی تھی پیدا
ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

میرے افکار کے پھولوں میں بہار آئی نہ تھی
میرے اشعار میں رنگینی و رعنائی نہ تھی
میری تخئیل میں ندرت نہ ہوئی تھی پیدا

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ جہاں سادہ تھا بے کیف تھا یا غمزدہ تھا
ایک اک ذرہ پریشان تھا ماتم زدہ تھا
باغِ ہستی میں مسرت نہ ہوئی تھی پیدا

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

حسن خنداں تھا نہ دیوانے نظر آتے تھے
شمع روشن تھی نہ پروانے نظر آتے تھے
یہ جنوں اور یہ وحشت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

شیریں آئی تھی نہ ایراں کی فضا سے اب تک
کوئی بلقیس نہ اُٹھی تھی سبا سے اب تک
اور سلیماں کی عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

نغمۂ بہار

پھر بہار آئی ہواؤں کو گل افشاں کر دیں
ساغر حسن و گل و نغمہ کو رقصاں کر دیں
سوز و ساز دلِ بیتاب کو ارزاں کر دیں
ایک شعلے سے جہاں بھر میں چراغاں کر دیں
شاہد و شمع کو دیں حکم چمن آرائی
نغمہ و نور بہم دست و گریباں کر دیں
پھول برسائیں درختوں سے سمن رو ہر سو

ایسی شوخی سے کہ تاروں کو پریشاں کر دیں

شمع رو، ناز سے صف بستہ ہوں بزم گل میں

سرو و ریحاں کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں

سایۂ زلف میں چہروں کو فروزاں کر کے

وادیٔ ابر میں انجم کو درخشاں کر دیں

کبھی اس بت کا گل عارض رنگیں چھولیں

کبھی اس شوخ کی زلفوں کو پریشاں کر دیں

عظمت فقر کو رخشندہ جمالوں کی قسم

ذرے ذرے کو حریف مہ تاباں کر دیں

بے نوایان در پیر مغاں کو ہمدم

قیصر عالم و شاہنشہ دوراں کر دیں

شیخ کعبہ کو سزا دیں یہ ریاکاری کی

جام در کف کسی بت خانے میں نقصاں کر دیں

شہرت آئے تو اُسے بھیج دیں زاہد کی طرف

ہوس آئے تو کسی پیر پہ احساں کر دیں

وامق رنج رسیدہ کے سکوں کی خاطر

مثل گیسوئے دل عذرا کو پریشاں کر دیں

مریمؔ تو بہ گر اس بزم میں آنا چاہے

خیر مقدم کے لئے وا در عصیاں کر دیں

اس طرح اس ارمِ خواب نما میں اختر
اپنے افکار کی عذراؤں کو عریاں کر دیں

آزادی

پکارتی ہے ہمالہ کی رفعتِ آزاد
کہ ہے ستاروں کا ہمسر مقامِ آزادی
چلی نسیم اُٹھیں نکہتیں اُڑے طائر
چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی
کرے نہ مرغِ چمن حوصلہ تو کس کا قصور
قفس سے دُور نہیں ہے مقامِ آزادی

ابر سے

برس، نہ دیر کر اے ابرِ نو بہار برس
برس کہ دیر سے تھا تیرا انتظار برس
برس کہ سوز کا گہوارہ بن رہی ہے زمیں
برس کہ تشنہ ہیں وادی و سبزہ زار برس
فسردگی سی ہے طاری گل و ریاحیں پر

الم زدہ سے ہیں اشجار و شاخسار برس
برس کہ خاک کا دل ہو نہیں سکا سیراب
ہیں صیدِ تشنہ لبی اب بھی غنچہ زار برس

مرنے کے بعد

چمن زار شاداب و خنداں رہیں گے	درختوں پہ طائرِ غزلخواں رہیں گے
فضاؤں میں بادل پرافشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
گھٹائیں گلستاں پہ چھایا کریں گی	فضائیں یونہی لہلہایا کریں گی
درختوں کے دامن گل افشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے	صداؤں سے معمور رستے رہیں گے
بپا زندگانی کے طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی	ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ روشن چراغاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
کہستاں سے چشمے اُبلتے رہیں گے	سرِ راہ موتی پگھلتے رہیں گے

یہ سلابِ سیمیں خراماں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

میری داستانِ حیات

ستاروں کی کہانی کہیے، خوابوں کا بیاں لکھیے
وہ کہتی ہیں کہ اپنی زندگی کی داستاں لکھیے

ہماری زندگی نیرنگیٔ عالم کا منظر ہے
کبھی آرامِ دل کہیے کبھی آزارِ جاں لکھیے

چمن میں برگِ گل پر قطرۂ شبنم جو لرزاں ہے
اُسے پیشِ نظر رکھیے ہماری داستاں لکھیے

کبھی ہر سانس کو اک نکہتِ آبِ بقا کہیے
کبھی ہر لمحے کو پیغامِ مرگِ ناگہاں لکھیے

کبھی پھولوں کی سیجوں کو ہمارا دردِ سر کہیے
کبھی جنگل کے کانٹوں کو ہمارا آشیاں لکھیے

کبھی سلمیٰ کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشقِ رائگاں لکھیے

کبھی حسنِ ثریا کو ہمارا آئنہ کہیے
کبھی ناہید کے دل کو ہمارا آشیاں لکھیے

کبھی غالب کو اور مومن کو کہئے ہمصفیر اپنا
کبھی خیام و حافظ کو ہمارا ہم زباں لکھئے
غرض اختر کی ساری زندگی کا یہ خلاصہ ہے
کہ پھولوں کی کہانی کہئے شعلوں کا بیاں لکھئے

عشرتِ رفتہ

تجھے کیوں عشرتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر؟
مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پرانے قصے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر

○

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن دوسرے دن مسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں

○

تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل
بلا کر عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل

دُنیا

تری دنیا میں گر مکار ہی مکار بستے ہیں

تو میرا سینہ کیوں اخلاص سے معمور ہے یارب!

مرا ہی دل مئے اُلفت سے کیوں مخمور ہے یارب!

ترے میخانۂ ہستی میں گر عیار بستے ہیں

تری دُنیا اگر بے درد انسانوں کا مسکن ہے

تو مجھکو کیوں کیا ہے دردِ دل سے آشنا تونے؟

مجھی کو کیوں بنایا پیکرِ رحم و وفا تونے؟

تری دُنیا اگر خونخوار حیوانوں کا مسکن ہے

اگر اپنوں کے غم پر مسکراتے ہیں ترے بندے

تو مجھکو کیوں پرائے غم پہ بھی رونا سکھایا ہے؟

مری آنکھوں میں کیوں سارے جہاں کا دکھ بسایا ہے؟

اگر اس حال میں آنکھیں چراتے ہیں ترے بندے

تری دنیا کی رونق فکر جھوٹ اور بیوفائی ہے

یہاں تیری خدائی ہے کہ شیطاں کی خدائی ہے؟

بہارِ خواب کی تنویرِ مرمریں عذرا | شراب و شعر کی تفسیرِ دلنشیں عذرا
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تونے | شباب و عشق کو بیدار کر دیا تونے

مری حسین، مری نازآفریں عذرا

طیورِ آوارہ

چوتھا مجموعۂ کلام

طیورِ آوارہ

شب کو سیلو میں جو وہ ماہِ سیہ پوش آیا
ہوش کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا

جب نشاں تک نہ رہا قبر کا باقی میری
تب مری تربت پہ وہ زود فراموش آیا

اُن کا زانو تھا مرا سر، مرا دل ہاتھ اُن کا
بے خودی تیرا بُرا ہو، مجھے کب ہوش آیا

دو گھڑی مل بھی گئی گر غمِ دنیا سے نجات
چٹکیاں لیتا ہوا دل میں غمِ دوش آیا

دل و دماغ کو رو لوں گا، آہ کر لوں گا
تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
اگر مجھے نہ ملیں تم، تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

رقیب سے بھی ملوں گا، تمہارے حکم پہ میں
جواب تلک نہ کیا تھا اب آہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں، کاٹ دوں گا حشر سے دن
تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا
کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اخترؔ
جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

○

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا
شرابِ عشق میں ایسی کشش سی تھی اخترؔ
کہ لاکھ ضبط کیا اجتناب ہو نہ سکا

○

رسم فرہاد ہے دنیا میں ابھی تک زندہ
یہ تماشا بھی کبھی اُن کو دکھا دینا تھا
ہو کے ناکام ہوس کار بنے کیوں اخترؔ
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

○

ذرّے ذرّے میں بے حجاب ہیں وہ
جن کو دعوے ہے منہ چھپانے کا

حاصلِ عمر ہے شباب، مگر — اک یہی وقت ہے گنوانے کا

تیری آنکھوں کی ہو نہ ہو تقصیر — نام رُسوا شراب خانے کا

دیکھتے ہیں ہمیں وہ چھپ چھپ کر — پردہ رہ جائے مُنہ چھپانے کا

کر دیا خوگرِ ستم اختؔر

ہم پہ احسان ہے زمانے کا

○

غم عزیزوں کا حسینوں کی جدائی دیکھی !

دیکھیں، دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں

محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے

میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

○

تازہ بتازہ، نو بہ نو، جلوہ بجلوہ چھپائے جا

پھولوں میں مسکرائے جا، تاروں میں جگمگائے جا

فتنۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اُٹھائے جا

نیچی نظر کئے ہوئے بام پہ مُسکرائے جا

میں ہوں وہ مست جس کو ہے کیف کی نادرتوں کا ذوق

شام و سحر کے جام میں شمس و قمر ملائے جا

طور خراب ہو نہ ہو، دید کی تاب ہو نہ ہو

کوئی جواب ہو نہ ہو، برقِ نظر گرائے جا

تیرے اور اس کے درمیاں تیری خودی حجاب ہے

اپنا نشان کھوئے جا اُس کا مقام پائے جا

جام بہ جام خم بہ خم، غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل

نکہت و رنگ لائے جا، نور و طرب پلائے جا

○

کچھ تو تنہائی کی راتوں کا سہارا ہوتا
تم نہ ہوتے نہ سہی ذکر تمہارا ہوتا

وہ اگر آ نہ سکے موت ہی آئی ہوتی
ہجر میں کوئی تو غمخوار ہمارا ہوتا

زندگی کتنی مسرت سے گزرتی یارب
عیش کی طرح اگر غم بھی گوارا ہوتا

عظمتِ گریہ کو کوتاہ نظر کیا سمجھیں
اشک اگر اشک نہ ہوتا تو ستارا ہوتا

کوئی ہمدرد زمانے میں نہ پایا اختر
دل کو حسرت ہی رہی کوئی ہمارا ہوتا

○

ہزار بزم مہیائے مرگ نیم شبی است

ہنوز مطرب اسیر نوائے زیرلبی است

دو چیز آں کہ جواں است و ہم جواں سازد

نگاہِ شوخ و فسوں سازو بادۂ عنبی است

○

آتی ہے جھومتی ہوئی بادِ بہارِ عید
مستِ طرب ہے آج ہر اک میگسارِ عید
بچھڑی ہوئی سہیلیاں یوں ملتی ہیں گلے
ہو جس طرح کہ عید کوئی ہمکنارِ عید
اخترؔ کا ہر تبسمِ عریاں فریب ہے
اس پردۂ طرب میں نہاں ہے مزارِ عید

○

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف
جیسے مستی میں اُلٹ دے کوئی پیمانے چند
بجلیاں کالی گھٹاؤں میں ہیں یوں آوارہ
جیسے کہسار پہ رقصاں ہوں پریخانے چند
کیا کہوں کیا ہے خدا اور مذاہب کا ہجوم
اک حقیقت پہ ہیں چھائے ہوئے افسانے چند
بزمِ ہستی سے نکالے گئے اخترؔ کیا جلد
ابھی پینے بھی نہیں پائے تھے پیمانے چند

○

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور
مر جائیں گے جب ہم تو ہمیں یاد کرے گی

جی بھر کے ستا لے شبِ ہجراں کوئی دن اور

قبروں کی جو راتیں ہیں، وہ قبروں ہی کٹیں گی

آباد ہیں یہ زندہ شبستاں کوئی دن اور

لعنت بھی گناہوں کی ندامت مرے حق میں

ہے شکر کہ ہوں اس سے پریشاں کوئی دن اور

○

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر

اُس نے لکھا ہے کہ یوں تو ہمیں بدنام نہ کر

ہر ہوس پیشہ کو ہو جائے نہ اُلفت کا گماں

اپنے الطاف کو اے جانِ جہاں عام نہ کر

حشر میں ملنے کی اُمید بھی وہ بھی نہ رہی

وہ یہ کہتی ہیں کہ ناحق طمعِ خام نہ کر

نازسے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھا ہاتھ اختر

یوں گدایانہ تماشائے لبِ بام نہ کر

○

خواب نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار

نور و نکہت کی داستانِ خموش

تم کو اختر بھی یاد آتا ہے

کھویا کھویا سا وہ جوانِ خموش

ہر ذرہ اُس کے حسن سے روشن ہے آج کل
امرتسر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل
اُس حسنِ بے پناہ نے بے خانماں کیا
جو رہنما تھا عشق میں رہزن ہے آج کل
راتوں یہ چاندنی ہے فضا پُر بہار ہے
وحشت ہے، ہم ہیں، دامنِ گلشن ہے آج کل

○

آئیے پردہ نہیں جلوۂ پنہاں کی قسم
ہم نہ چھیڑیں گے ہمیں زلفِ پریشاں کی قسم
میرے ارماں سے واقف نہیں شرمائیے آپ
آپ کیوں کھاتے ہیں ناحق مرے ارماں کی قسم

○

یقینِ وعدہ نہیں، تابِ انتظار نہیں
کسی طرح بھی دلِ زار کو قرار نہیں
بہار آئی ہے ایسے میں تم بھی آ جاؤ
کہ زندگی کا برنگِ گل اعتبار نہیں
ہر ایک جام پہ، یہ نغمۂ حزیں ساقی
کہ اس جوانیٔ رفتنی کا اعتبار نہیں

○

ناز ہے زاہد کو جس زہد ریائی پہ، اُسے

مہوشانِ میکدہ کے سامنے عریاں کریں

پھر لبِ مینا سے چھلکائیں رسیلی بجلیاں

پھر متاعِ غم کو نذرِ شعلۂ عریاں کریں

منزلِ جاناں تک آخرؔ ہم پہنچ ہی جائیں گے

پہلے اپنی جاں کو تو خاکِ رہِ جاناں کریں

○

تمناؤں کو زندہ، آرزوؤں کو جواں کر لوں

یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں

حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کر لوں

کسے معلوم کب، کس وقت، کس پر گر پڑے بجلی

ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر آخرؔ

تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

○

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے

کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں، کھل جائیں کلیاں

جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاھد

تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تک

مرے عشق رسوا کو آخر دعا دیں

○

کس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں؟

میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جدھر جاتے ہیں

بھولتی ہی نہیں دل کو تری مستانہ نگاہ

ساتھ جاتا ہے یہ میخانہ جدھر جاتے ہیں

کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے

راہ میں جبین کے دل کٹتے ہیں گھر جاتے ہیں

○

عمر بھر کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں

جس کی آنکھوں پہ تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دل کے پردوں میں تھیں جو جو حسرتیں پردہ نشیں

آج وہ آنکھوں میں آنسو بن کے عریاں ہو گئیں

بس کرو، او میری رونے والی آنکھو بس کرو

اب تو اپنے ظلم پر وہ بھی پریشاں ہو گئیں

آہ، وہ دن جو نہ آئے پھر گزر جانے کے بعد
ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں

○

ایک پردہ ہے غموں کا، جسے کہتے ہیں خوشی
ہم تبسم میں نہاں اشکِ رواں دیکھتے ہیں
ہر مسرت ہے غمِ تازہ کی تمہید اے دل
نغمۂ شوق میں آثارِ فغاں دیکھتے ہیں
دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اختر
کوئی دن اور تماشائے جہاں دیکھتے ہیں

○

مری شامِ غم کو وہ بہلا رہے ہیں
لکھا ہے یہ خط میں کہ ہم آ رہے ہیں
محبت کے جلوے نظر آ رہے ہیں
نگاہوں سے پردے اُٹھے جا رہے ہیں
غمِ عاقبت ہے نہ فکرِ قیامت
پئے جا رہے ہیں جئے جا رہے ہیں
وہ جانِ بہار آج آئے گی اختر
کنول حسرتوں کے کھلے جا رہے ہیں

○

لا پلا ساقی، شرابِ ارغوانی پھر کہاں
زندگانی پھر کہاں، ناداں جوانی پھر کہاں
دو گھڑی مل بیٹھنے کو بھی غنیمت جانئے

عمرِ فانی ہی سہی، یہ عمرِ فانی پھر کہاں

پھول چُن چن جی کھول کر عیش و طرب کے پھول چُن

موسمِ گل پھر کہاں، فصلِ جوانی پھر کہاں

آخری رات آ گئی جی بھر کے مل لیں آج تو

تم سے ملنے دے گا، دورِ آسمانی پھر کہاں

آج آئے ہو تو سنتے جاؤ یہ تازہ غزل

ورنہ اختر پھر کہاں، یہ شعر خوانی پھر کہاں

○

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

جوانی بھی تو اک موجِ شرابِ تند و رنگیں ہے

بُرا کیا ہے اگر ہم مشربِ رندانہ رکھتے ہیں

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا

فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

○

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو

تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول

شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

مصرِ فراق کب تلک اے یُوسفِ اُمید
روتا ہے تیرے ہجر میں کنعانِ آرزو

دل میں نشاطِ رفتہ کی دُھندلی سی یاد ہے
یا شمعِ وصل ہے تہِ دامانِ آرزو

○

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش بیجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

○

بھلا کیونکر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اُس کی
کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اُس کی

مئے اُلفت کے سرشاروں کو میخانے سے کیا مطلب؟
ادا روحِ نشاط اُس کی نظر جانِ بہار اُس کی

یہاں کیا دیکھتے ہو نا صحو، گھر میں دھرا کیا ہے؟

مرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈو یادگار اُس کی

ہمیں عرضِ تمنا کی جسارت ہو تو کیونکر ہو
نگاہیں فتنہ ریز اس کی، ادائیں حشر بار اُس کی

○

کوئلیں کوکیں، پپیہے پی کہاں کہنے لگے
نغموں سے لبریز ہے رنگیں فضا برسات کی
جھولتی ہیں تتلیوں کی طرح کم سن مہوشیں
یا شگوفوں کو اڑاتی ہے ہوا برسات کی
سر سے ڈھلکے ہیں دوپٹے، بال بکھرے سر کھلے
چھیڑتی ہے نازنینوں کو ہوا برسات کی
شاخساروں سے ملہاروں کی صدا آنے لگی
کیا سہانے گیت گاتی ہے گھٹا برسات کی

○

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
سارے دُنیا پر جوانی چھا گئی
گیسوئے مشکیں میں یہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی
پارسائی کی جوانمرگی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی

اخترؔ اس جانِ تمنا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

○

نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی
رہی تو میری کہانی ہی یادگار رہی

تمام عمر رہا گرچہ میں تہی پہلو
بسی ہوئی مرے پہلو میں بوئے یار رہی

کوئی عزیز نہ ٹھہرا ہمارے دفن کے بعد
رہی جو پاس تو شمعِ سرِ مزار رہی

وہ پھول ہوں جو کھلا ہو خزاں کے موسم میں
تمام عمر جسے حسرتِ بہار رہی

کبھی نہ بھولیں گی اس شب کی لذتیں اختر
کہ میرے سینے پہ وہ زلفِ مشکبار رہی

○

وہ کہتے ہیں کہ ہم سے پیار کی باتیں نہیں اچھی
کوئی سمجھائے یہ تکرار کی باتیں نہیں اچھی

تمہاری ہی طرح اغیار بھی اچھے سہی لیکن
ہمارے سامنے اغیار کی باتیں نہیں اچھی

عدو کے ساتھ، بہرِ فاتحہ اور میرے مدفن پہ
بہت اچھا، مگر سرکار کی باتیں نہیں اچھی

لکھیں تو اپنا حالِ دل انھیں کیونکر لکھیں اختر
وہ لکھتے ہیں کہ خط میں پیار کی باتیں نہیں اچھی

○

ملی نہ سعیِ برہمن سے زاہدوں کی مراد
چراغِ دیر سے تاریکیٔ حرم نہ گئی

وہ میری شوخ نگاری پہ لکھتے ہیں اختر
ابھی تک آپ کی گستاخیٔ قلم نہ گئی

○

اشکباری نہ مٹی، سینہ فگاری نہ گئی — لالہ کاری کسی صورت بھی ہماری نہ گئی

مدتیں ہوگئیں، بچھڑے ہوئے تم سے لیکن — آج تک دل سے مرے یاد تمہاری نہ گئی

سینکڑوں بار مرے سامنے کی توبہ، مگر

توبہ اختر کہ تری بادہ گساری نہ گئی

○

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو

وہ عذرا کا خرامِ رائیگاں ہے

○

شان میں مے کی زاہدا اس کے سوا میں کیا کہوں

میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے

عشق میں سوگوار سا، بے خود و بے قرار سا

تم کو خبر ہو یا نہ ہو، اختر اسی کا نام ہے

○

ہم دعا کرتے رہے جن کے لئے — کاش وہ مل جائیں اک دن کے لئے

میرے ارمانوں سے کہتی ہے اجل — اس قدر ساماں دو دن کے لئے

ان کو ارماں ہے ہماری موت کا — مر مٹے اے زندگی جن کے لئے

ان کو رحم آ ہی گیا، آ ہی گئے

حسرتیں مضطر تھیں اس دن کے لئے

○

اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے

اُس بزم میں جائیں تو یہ کہتی ہیں ادائیں
کیوں آئے ہو کیا سر پہ قضا کھیل رہی ہے

اُس چشمِ سیہ مست پہ گیسو ہیں پریشاں
میخانے پہ گھنگھور گھٹا کھیل رہی ہے

بدمستی میں تم نے اُنھیں کیا کہہ دیا اخترؔ
کیوں شوخ نگاہوں میں حیا کھیل رہی ہے

○

دیوانہ کر دیا ہے غمِ انتظار نے
اب تک خبر نہ لی مری غفلت شعار نے

دُنیا کے فکر، دین کی باتیں، خدا کی یاد
سب کچھ بھلا دیا ترے دو دن کے پیار نے

توبہ بھلائے دیتی ہے پیرِ مغاں کا گھر
اُٹھ کر بتا دیا ہمیں ابرِ بہار نے

○

آشنا ہو کر تغافل آشنا کیوں ہو گئے؟
باوفا تھے تم، تو آخر بے وفا کیوں ہو گئے

اُن وفاداروں کے وعدوں کو الٰہی کیا ہوا
وہ وفائیں کرنے والے، بیوفا کیوں ہو گئے

یہ جوانی یہ گھٹائیں یہ ہوائیں یہ بہار
حضرتِ اخترؔ ابھی سے پارسا کیوں ہو گئے؟

عمرِ فانی کی ذرا قدر نہ جانی ہم نے　　خواب کی طرح سے کھوئی ہے جوانی ہم نے
جو کبھی خواب میں بھی آئیں تو کھلا جائیں　　ایسی پریوں میں گنوائی ہے جوانی ہم نے
رو دیئے دیکھ کر اُس پردہ نشیں کو اخترؔ
اپنی آنکھوں سے کہی دل کی کہانی ہم نے

○

حوریں نیکوں میں بٹ چکی ہوں گی　　باغِ رضواں میں اب رکھا کیا ہے؟
اب دوا کیسی ہے دعا کا وقت　　تیرے بیمار میں رہا کیا ہے؟

○

اے صبا کون سے گلزار سے تُو آتی ہے
تجھ سے اُس غنچہ دہن کی مجھے بُو آتی ہے
پاس فطرت کو ہے کتنا مری مے نوشی کا
جو کلی آتی ہے وہ لے کے سبُو آتی ہے
کچھ تو کہہ ہم سے کہاں آنکھ لڑی ہے اخترؔ
تیرے شعروں سے ہمیں عشق کی بو آتی ہے

○

جب مری قبر پہ وہ پھول چڑھانے آئے
موت کی نیند کے ماتوں کو جگانے آئے
کوئی اُس وعدہ فراموش سے اتنا کہتا
آپ اب کس لئے روٹھوں کو منانے آئے

شمع کی طرح جلاتے تھے ہمیں فرقت میں
اب دعا کے لئے کیوں ہاتھ اٹھانے آئے

جب میں روتا تھا مرے رونے پہ ہنس دیتے تھے
اب مری یاد میں کیوں اشک بہانے آئے

تم تو اک دن مرے شکوے بھی نہ سن سکتے تھے
اب مجھے کیوں غمِ دل اپنا سنانے آئے

○

دل میں اب تک ہوسِ گلبدناں باقی ہے
مٹ گئی عمرِ جواں، عشقِ جواں باقی ہے

کتنے ہی سال گزر جائیں میں یاد آؤں گا
تیرے در پر مرے سجدوں کا نشاں باقی ہے

○

خیالستانِ ہستی میں اگر غم ہے خوشی بھی ہے
کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی لب پر ہنسی بھی ہے

انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہے

یونہی تکمیل ہوگی حشر تک تصویرِ ہستی کی
ہر اک تکمیل آخر میں پیامِ نیستی بھی ہے

○

اگر وہ اپنے حسین چہرے کو بھول کر بے نقاب کر دے
تو ذرّے کو ماہتاب اور ماہتاب کو آفتاب کر دے

حریمِ عشرت میں سونے والے شمیمِ گیسو کی مستیوں سے
مری جوانی کی سادہ راتوں کو اب تو سرشارِ خواب کر دے

نظر نہ آنے پہ ہے یہ حالت کہ جنگ ہے شیخ و برہمن میں
خبر نہیں کیا سے کیا ہو دنیا جو خود کو وہ بے نقاب کر دے

خدا نہ لائے وہ دن کہ تیری سنہری نیندوں میں فرق آئے
مجھے تو یوں اپنے ہجر میں عمر بھر کو بیزارِ خواب کر دے

○

نہ چھیڑ زاہدِ ناداں شراب پینے دے
شراب پینے دے خانہ خراب پینے دے

میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ
تو اس گناہ کو بے احتساب پینے دے

مرے دماغ کی دنیا کا آفتاب ہے یہ
ملا کے برف میں یہ آفتاب پینے دے

کسی حسینہ کے بوسوں کے قابل اب نہ رہے
تو ان لبوں سے ہمیشہ شراب پینے دے

سمجھ کے اس کو غفور الرحیم پیتا ہوں
نہ چھیڑ ذکرِ عذاب و ثواب پینے دے

○

عشق کی مایوسیوں میں کھو چکے
اے جوانی جا تجھے ہم رو چکے

میرا ویرانہ ترستا ہی رہا
پھول کھل کر بے نشاں بھی ہو چکے

آج کی شب پھر کوئی یاد آ گیا
آج کی شب بھی ہم اختر ہو چکے

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے

مگر اپنے دل کو میں کیا کروں اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

انھیں ضد ہے عرضِ وصال سے مجھے شوقِ عرضِ وصال ہے

وہی اب بھی ان کا جواب ہے، وہی اب بھی میرا سوال ہے

میں وطن میں رہ کے بھی بے وطن کہ نہیں ہے ایک بھی ہم سخن

ہے کوئی شریکِ غم و محن تو وہ اک نسیمِ شمال ہے

یہی دادِ قصۂ غم ملی کہ نظر اُٹھی، نہ زباں ہلی،

فقط اک تبسّمِ شرمگیں مری بے کسی کا مآل ہے

○

ستم ظریفیٔ فطرت، یہ کیا معمّا ہے | کہ جس کو کوئی نگھوں میں تو بار بار آئے

ترے خیال کی بے تابیاں معاذ اللہ | کہ ایک بار بھلائیں تو لاکھ بار آئے

وہ آئیں یوں مرے آغوشِ عشق میں اختر

کہ جیسے آنکھوں میں اک خوابِ بیقرار آئے

○

مری آنکھوں سے ظاہر خوں فشانی اب بھی ہوتی ہے

نگاہوں سے بیاں دل کی کہانی اب بھی ہوتی ہے

وہ شب کو مشکبو پردوں میں چھپ کر آ ہی جاتے ہیں

مرے خوابوں پہ اُن کی مہربانی اب بھی ہوتی ہے

کہیں اغیار کے خوابوں میں چھپ چھپ کر نہ جاتے ہوں

وہ پہلو میں ہیں لیکن بدگمانی اب بھی ہوتی ہے

خفا ہیں پھر بھی آکر چھیڑ جاتے ہیں تصور میں

ہمارے حال پر کچھ مہربانی اب بھی ہوتی ہے

پس توبہ بھی پی لیتے ہیں جام غنچہ و گل سے

بہاروں میں جنوں کی میہمانی اب بھی ہوتی ہے

○

گلشن میں چند راتیں خوشی سے گزار کے ابر رواں کے ساتھ گئے دن بہار کے

ابر سیہ میں برق حسیں لہلہا اٹھی یا آ گئے وہ سامنے گیسو سنوار کے

آؤ کہ ایسا وقت نہ پاؤ گے پھر کبھی

آتے ہیں روز روز کہاں دن بہار کے

○

غم زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

اٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگے وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی

نکال پردۂ مینا سے دختر رز کو گھٹائیں کس لئے یہ ماہتاب ہے ساقی

کلام جس کا ہے معراج حافظ و خیام

یہی وہ اختر خانہ خراب ہے ساقی

○

رباعی: عید آئی ہے عیش و نوش کا ساماں کر اک ساقی گلعذار کو مہماں کر

قربانی ہے واجب آج اختر تو بھی توبہ کو خدا کے نام پر قرباں کر

جنت کا سماں دکھا دیا ہے مجھ کو
کونین کا غم بھلا دیا ہے مجھ کو
کچھ ہوش نہیں کہ ہوں میں کس عالم میں
ساقی نے یہ کیا پلا دیا ہے مجھ کو

گیت

بڑے سکھ سے یہ بیتے بختے چودہ برس، کبھی میں نے پیا نہ تھا سیم کا رس
مری آنکھوں کو شیام دکھا کے درس، مرے ہردے میں چاہ بسا ہی گئے
کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی، کبھی بھول کے دکھ سے میں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے، مجھے پریت کے دکھ سے رلا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں، سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں
انھیں دیکھ کے آنسو جو آ ہی گئے، مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

○

برہ میں بیتی جائے جوانی
پریتم، برہ میں بیتی جائے
روگ لگا ہے کیسا جی کو
لکھ دے کوئی پردیسی پی کو
پھول سی کمھلائے جوانی
سجنی پھولوں سی کمھلائے
مایوسی نے من کو ہے گھیرا
آنسوؤں کا آنکھوں میں بسیرا
آنسو بنے بہ جائے جوانی
سجنی آنسو بنے بہ جائے
رین اندھیری سیج ہے سونی

۱

بپتا پڑی ہے آکر دونی

برہن کو تڑپائے جوانی   سجنی برہن کو تڑپائے

○

اب بھی نہ آئے من کے چین

بیت چلی ہے آدھی رین

نا کوئی ساتھی نا کوئی سجنی نا کوئی میرے پاس سہیلی

برہہ کی لمبی رات گزاروں ڈر کی ماری کیسے اکیلی

نیر بہائیں کب تک نین

اب بھی نہ آئے من کے چین

نظریں جمی ہیں چوکھٹ پر اور کان لگے ہیں آہٹ پر

آنکھوں سے ننھے ننھے سے آنسو بہتے ہیں اک کروٹ پر

کرتی ہوں چپکے چپکے بین

اب بھی نہ آئے من کے چین

بیت چلی ہے آدھی رین

○

آؤ سجن گھر آؤ رے اب تو ہم کو سونی رات ڈرائے

کاری کاری بدلی لائے بجلی من میں آگ لگائے

سونی رات ڈرائے ساجن ۔ ہم کو سونی رات ڈرائے

کوئل کوکے مدھ ماتی اور سن کر دھڑکے میری چھاتی

ایسے میں ہے کون جو میرے بچھڑے پی کو منائے

سونی رات ڈرائے ساجن، ہم کو سونی رات ڈرائے

پی ہیں میرے میں ہوں پی کی بات چھپاؤں کیونکر جی کی

پی پی کر کے پی کی کہانی، پاپی پپیہا پھر کیوں گائے

سونی رات ڈرائے ساجن۔ سونی رات ڈرائے

○

اب تو آؤ پاس ہمارے

دل کے سہارے آنکھ کے تارے

بیت چلیں مہتاب کی راتیں   پیار کے میٹھے خواب کی راتیں

ہجر کے دن بھی کتنے گزارے

اب تو آؤ پاس ہمارے

کالے کوسوں چھاؤنی چھائی   دل سے ہماری یاد بھلائی

بیٹھے ہو کب سے ہم کو بسارے

اب تو آؤ پاس ہمارے

خوش ہے بلبل پھول کے غم سے   اور پتنگا شمع کے دم سے

ہائے جئیں ہم کس کے سہارے

اب تو آؤ پاس ہمارے

○

نغمۂ حرم

پانچواں مجموعۂ کلام

پانچواں مجموعۂ کلام

نغمۂ حرم

دُعا

الٰہی مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کر دے
جو بزمِ دہر میں ہنگامۂ محشر بپا کر دے
سرودِ آبادِ ہستی میں میں اک سازِ شکستہ ہوں
مرے خاموش تاروں کو ترنم آشنا کر دے
کسی سے مجھ کو کینہ ہو عداوت ہو نہ نفرت ہو
ایاغِ دل کو لبریزِ مئے صدق و صفا کر دے
مصیبت میں بھی صبر و شکر کے نغمے زباں پر ہوں
اسیرِ گیسوئے رسمِ شہیدِ کربلا کر دے
صنم خانے میں ذوقِ وحدت اک دشوار منزل ہے
حریمِ معرفت میں بے نیازِ ما سوا کر دے

○

سالِ نو

سالِ نو کا مطربِ رنگیں نوا گاتا ہوا
آ رہا ہے عشق و غم کے نغمے برساتا ہوا
سینے پر مہتاب و انجم کی روپہلی آب و تاب
سر پہ سورج کا سنہری تاج چمکاتا ہوا
آگے آگے نازنینانِ تمدن کا ہجوم
اپنے رنگیں دامنوں سے پھول برساتا ہوا
ایک جانب ہیں خوشی کی نازنینیں محوِ رقص
ایک جانب پیرِ غم ہے اشک برساتا ہوا
لیکن ان میں سب سے آگے حاکمِ تقدیر ہے
سالِ نو کے خواب کی کیا جانے کیا تعبیر ہے

شمعِ حرم

سوزِ عشقِ احمدی سے دل مرا لبریز تھا
خندہ زن تھی اوجِ مہر و ماہ پہ پستی مری
جس کے دو دانی سے پروانے تھے سلمانؓ و بلالؓ
ہاں وہ موجِ شعلۂ الہام تھی ہستی مری
روحِ انساں تھی ابھی نا محرمِ رازِ الست

ہستیٔ شیطاں سراسر قدس اک افسانہ تھی

جرعہ نوشِ بادۂ ہستی سے سرمستِ الست

گرچہ فطرت جلوہ رازِ ساغر و پیمانہ تھی

تب بھی ان رنگیں ستاروں کی طرح روشن تھی ہیں

فطرتِ آدم کی گہرائی میں طوفاں زن تھی میں

ایک دیہاتی لڑکی کا گیت

سنو یہ کیسی آواز آرہی ہے
کوئی گاؤں کی لڑکی گارہی ہے

اُٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو
کہ چکی کی صدا بھی آرہی ہے

فضا پر، بستیوں پر، جنگلوں پر
دھواں دھار ایک بدلی چھا رہی ہے

چھما چھم مینہ کی بوندیں پڑ رہی ہیں
کہ ساون کی پری کچھ گارہی ہے

مگر ہے غم کی تاثیر اس خوشی میں
گزشتہ زندگی یاد آرہی ہے

ہوا کی سرسراہٹ ہے کہ فطرت
پرانی زندگی دہرا رہی ہے

یہ بادل کی گرج بجلی کا کڑکا
خدائی ساری لرزی جارہی ہے

یہ بوندیں، ہیں کہ بجلی آسماں سے
ستارے توڑ کر برسا رہی ہے

مگر وہ غم زدہ معصوم لڑکی
برابر گیت گائے جارہی ہے

ہوا ٹھنڈی ہوا بھرتی ہے آہیں
فضا دُھندلی فضا تھرا رہی ہے

نہ جانے کیا اثر ہے اس صدا میں
کہ خود فطرت بھی بہکی جارہی ہے

یہ گھر سسرال ہوگا شاید اس کا
جبھی ماں باپ کی یاد آرہی ہے

جبھی مصروف ہے آہ و فغاں میں — جبھی غمگین لے میں گا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا جو گاؤں کو مہکا رہی ہے — مرے میکے سے شاید آ رہی ہے

یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل — تمہاری یاد آفت ڈھا رہی ہے

یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

مری اماں کو ہو اس کی خبر کیا — کہ چھیا اس جگہ گھبرا رہی ہے

یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

نہ لی بھیا نے بھی سدھ بدھ ہماری — جہاں سے چاہ اُٹھتی جا رہی ہے

یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

یونہی وہ اپنی غمگیں راگنی سے — در و دیوار کو تڑپا رہی ہے

سیاہی اُڑتی جاتی ہے اُفق سے — عروسِ صبح بڑھتی جا رہی ہے

شوالے میں گجر بھی جاگ اُٹھا — ٹھنا ٹھن ٹھن کی آواز آ رہی ہے

مگر ان سب سے بے پروا وہ لڑکی — برابر گیت گائے جا رہی ہے

اسے سُن سُن کے کب تک سر دُھنو گے

بس اخترؔ سونے دو نیند آ رہی ہے

آخری اُمید

مرا ننھا جواں ہو گا

کبھی تو رحم پہ آمادہ بے رحم آسماں ہوگا   کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا

کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گلفشاں ہوگا

مسرت کا سماں ہوگا

مرا ننھا جواں ہوگا

خدا رکھے جواں ہوگا تو ایسا نوجواں ہوگا   حسین و کارداں ہوگا دلیر و تیغ راں ہوگا

بہت شیریں زباں ہوگا، بہت شیریں بیاں ہوگا

یہ محبوبِ جہاں ہوگا

مرا ننھا جواں ہوگا

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کریگا یہ   خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کریگا یہ

ہر اپنے اور پرائے سے سدا اُلفت کرے گا

ہر اک پہ مہرباں ہوگا

مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگِ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے   یہ اُس شیدائے ملت باپ کا پُرجوش بیٹا ہے

ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے

وطن کا پاسباں ہوگا

مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کے نام پہ اک روز یہ تلوار اٹھائیگا   وطن کے دشمنوں کو کنجِ تربت میں سلائیگا

اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائیگا

غرورِ خانداں ہوگا   مرا ننھا جواں ہوگا

رات کے فرشتے

ہواؤں میں رات کے فرشتے روپہلی پر پھٹ پھٹا رہے ہیں
سکوت کے میٹھے میٹھے لہجوں میں نیند کے گیت گا رہے ہیں
نظامِ ہستی پہ سر بسر غفلتوں کے پردے گرا رہے ہیں
نظر سے نقشے، سروں سے خاک کے دلوں سے باتیں مٹا رہے ہیں

خموش و مدہوش ہیں فضائیں! صدا فراموش ہیں ہوائیں
پروں سے گویا تھپک تھپک کر زمانہ بھر کو سُلا رہے ہیں
یہی خدا سے کریں گے جا کر شکایتیں سب کی غفلتوں کی
یہی ہمیں لوریاں سُنا کر خدا سے غافل بنا رہے ہیں

زمانہ خاموش ہو چکا ہے! خدائی مدہوش ہو چکی ہے
چمن کی خوشبوؤں سے لپٹ کر پری کی فطرت بھی سو چکی ہے

پردیسی پی کی یاد

خوشا وہ دن کہ لُطف و عیش کے ہم پھول چُنتے تھے
خوشا وہ دن کہ یوں تکلیفِ غم سے سر نہ دُھنتے تھے
صدا آتی تھی عشرت کی محبت کے ترانوں سے
فضائیں جاگ اُٹھتی تھیں مسرت کے فسانوں سے
مگر اب اُن کے جاتے ہی قیامت ہو گئی برپا

جس آفت کا تھا اندیشہ وہ آفت ہو گئی برپا

کسی کا ہجر ہے بیتابیاں ہیں اور دل میرا
سیہ راتیں ہیں اور بیخوابیاں ہیں اور دل میرا

مرا کیا اس طرح ناشاد ہونا ہی مقدر تھا
الٰہی کیا مرا برباد ہونا ہی مقدر تھا

یہ بھیگی رُت، یہ مستانہ ہوا، برسات کا موسم
بہاروں کا سماں یہ رس بھرے جذبات کا موسم

گھٹائیں دیکھ کر بیتاب ہو جاتی تھیں رہ رہ کر
سراپا پیکرِ سیماب ہو جاتی ہیں رہ رہ کر

یہ کیا جی میں سمائی بھول بیٹھے رسمِ اُلفت کو
یہ کیوں پامال کر ڈالا ہے یوں عہدِ محبت کو

اب اس سے بڑھ کے حسرتناک حالِ درد کیا ہو گا
میں اکثر غور کرتی ہوں مآلِ درد کیا ہو گا

نارضامندی کی شادی

بغیر مرضی کی شادی بھی کیا قیامت ہے
یہ عمر بھر کے لیئے اک مہیب لعنت ہے

یہ شادی وہ ہے جسے والدین کرتے ہیں
ادا سمجھ کے اسے فرضِ عین کرتے ہیں

یہ کچھ ضرور نہیں جانبین راضی ہوں

یہ شرط ہے کہ فقط والدین راضی ہوں

کہو اب ان زن و شوہر کا حال کیا ہوگا

اس ازدواج کا آخر مآل کیا ہوگا

تمام عمر رہین الم ہوئی کہ نہیں

تمام زندگی اب صرف غم ہوئی کہ نہیں

یہ شادی آہ جہنم کا راج کہئے اسے

سریرِ عیش پہ کانٹوں کا تاج کہئے اِسے

یہ شادی کیا ہے فقط تلخیوں کا مخزن ہے

جواں دلوں کی جواں حسرتوں کا مدفن ہے

قدیم دورِ جہالت کا اک شعار ہے یہ

کہ والدین کا ناجائز اختیار ہے یہ

جواں دلوں کو یہ شادی تباہ کرتی ہے

شگفتہ ہونٹوں کو مصروفِ آہ کرتی ہے

یہ بادہ وہ ہے کہ جس میں ملا ہوا ہے زہر

یہ شہد وہ ہے کہ جس میں ملا ہوا ہے زہر

جوان روحوں کی خاموش قتل گاہ ہے یہ

خدا کے نام پہ سب سے بڑا گناہ ہے یہ

○

اُن کا خیال

(گاگر بھرنے جاتے ہوئے شوہر کی یاد میں)

ابھی نہر تک بھی نہ آئی تھی کہ کسی خیال میں کھو گئی

نہ تو خوفِ آمدِ شام اُسے ہے نہ فکرِ بندِ نقاب ہے

یہ حسینہ محوِ خیال ہے کہ کہیں حسینہ کی شکل میں

کسی مست پھول کا جلوہ گر کوئی کھویا کھویا سا خواب ہے

وہی جس کی یاد نے یک بیک اُسے بیقرار سا کر دیا

وہی اس کا اصل جمال ہے وہی اس کا اصل شباب ہے

عورت

(فنونِ لطیفہ کی دنیا میں)

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے

مصوّر کی نظر میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں

ادب کی محفلوں میں اُس کی تحریریں پریشاں ہیں

مغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے

نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے

نقوشِ آب و گل میں اس کی تعمیریں پریشاں ہیں

صنم سازوں کے دل میں اس کی تفسیریں پریشاں ہیں

حریم رنگ و بو میں نقش بن کر لہلہاتی ہے

○

ہر اک تصویر کے رنگوں میں رنگت اس کی آوارہ

حسین اور خوشنما اشعار شاداب اسکے نغموں سے

ہمارے بربطوں کے تار بیخواب اسکے نغموں سے

بتوں کے مرمریں پیروں میں نگت اس کی آوارہ

غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اس کی خوشنمائی ہے

ہماری زندگی پر صرف عورت کی خدائی ہے

ساون کی گھٹا

(بچوں کے لئے)

مسکراتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

جی لبھاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

گیت کوئل کے پپیہوں کی صدا مور کا شور

گنگناتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

کوہساروں کا خیابانوں کا گلزاروں کا

منہ دھلاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

موجِ نکہت سے خدائی مہک اٹھی اختر

پھول اڑاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

ایک لڑکی کا گیت

(بچوں کے لئے)

جہاں چڑیاں گھنیری جھاڑیوں میں چہچہاتی ہیں
جہاں شاخوں پہ کلیاں نت نئی خوشبو لٹاتی ہیں
اور اُن پہ کوئلیں کوکو کے میٹھے گیت گاتی ہیں

وہاں، میں ہوں مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں برسات کے موسم میں سبزہ لہلہاتا ہو
ہوا کی چھیڑ سے ایک ایک پتہ تھرتھراتا ہو
جہاں، چشموں کا پانی رِم لے میں گنگناتا ہو

وہاں میں ہوں مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں اونچے پہاڑوں پر گھٹائیں گھر کے آتی ہوں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہوں
اور اپنے نیلگوں ہونٹوں سے موتی سے لٹاتی ہوں

وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں آموں کے ہوں باغ اور رکھوالا نہ ہو ہرگز
کوئی کتا کبھی مالی نے جہاں پالا نہ ہو ہرگز
اور اماں جی سا کوئی دیکھنے والا نہ ہو ہرگز

وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

الٰہی! میرے دل کی آرزو جلدی سے پوری ہو
وہاں لے چل جہاں اس فصل میں جانا ضروری ہو
مری ہو، شملہ ہو، سولن ہو، ڈلہوزی، مسوری ہو
وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

نور جہاں

خدائی نیند میں سرشار ہے برکھا کا موسم ہے
زمینِ شاہدرہ پر ہر طرف کھویا سا عالم ہے

افق پہ منتشر مہتاب کی سرشار لہریں ہیں
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندی کی نہریں ہیں

ردائے آسماں میں ننھے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زریں کھلکھلاتے ہیں

چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
کہ پریوں نے کہیں موتی بکھیرے ہیں پرستاں میں

رسیلی بو کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرو و سوسن پہ
نشہ کا سا سماں چھایا ہوا ہے سارے گلشن پہ

خموشی کا سماں اک ہو کا عالم ہے زمانہ پہ
سکوں طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانے پہ

نہا کر آئی ہیں اندر کی پریاں عطر کے جل میں
نشے کی موجیں اُڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں

روپہلی رات پر طاری ہے اندوہ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لیٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی

زمین و چرخ نے چپ سادھ لی ہے ہر صدا چپ ہے
اِدھر اُجلی فضا چپ ہے اُدھر ٹھنڈی ہوا چپ ہے

یہ بھیگی رات، یہ مستانہ رُت، یہ نور کا عالم
زمرد فام نخلستاں پہ برقِ طور کا عالم

اسی سنسان نخلستاں میں اک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اک شہنشاہِ گرامی کی محبت ہے

یہاں وہ بانوئے عفت نشاں سوتی ہے تُربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں

ادب، اے دل ادب کر روضۂ نورجہاں ہے یہ
مقدس خوابگاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ

بعض تاریخی تصورات

کوئی زائر جب اسکے مرقدِ انور پہ جاتا ہے
تو اُسکو سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے

جب اُس کا باپ نکلا تھا وطن سے بے وطن ہو کر
چلا تھا پھول صحرا کی طرف زیبِ چمن ہو کر

تو اس ہیبت فزا جنگل میں اک دختر ہوئی پیدا
قمر کی گود سے اک زہرۂ انور ہوئی پیدا

نہ سوجھی جب کوئی تدبیر اُنھیں اسکی حفاظت کی
تو رکھ لی بار کر چھاتی پہ سِل دونوں نے فرقت کی

لٹا کر چل دئے آخر اُسے سبزہ کے بستر پر
ستارے رو رہے تھے خون اس غمگین بستر پر

کہ یوں لختِ جگر کو چھوڑ کر جاتا نہیں کوئی
ذرا سی جان کو بے وجہ تڑپاتا نہیں کوئی

وہ دختر کون تھی؟ اے ملکۂ نورجہاں تو تھی
وہ بیکس کون تھی؟ اے بانوئے ہندوستاں تو تھی

مگر تقدیر کے آگے کسی کی چل نہیں سکتی
مسرت مٹ نہیں سکتی، مصیبت ٹل نہیں سکتی

صدا سُن کر ترے رونے کی اک سردار آپہنچا
عقب سے قافلہ کا قافلہ سالار آپہنچا

محبت سے وہ ہاتھوں پر اُٹھا کر لے گیا تجھ کو
تو گویا مرچکی تھی وہ جلا کر لے گیا تجھ کو

تری معصوم قسمت نے بھی کی پھر یاوری تیری
ہوئی تفویض تیری ماں کو ہی دایہ گری تیری

غرض تو پرورش پانے لگی قصرِ حکومت میں
بسر ہونے لگی طفلی تری دامانِ رحمت میں

یونہی آپہنچی جب طفلی تری حدِ جوانی میں
شباب اک موج بن کر اُٹھا بحرِ زندگانی میں

تو شادی کردی شاہنشہ نے تیری شیر افگن سے
خوشی کا غلغلہ اُٹھا نواسنجانِ گلشن سے

مگر کچھ دن میں لایا رنگ یہ چرخِ کہن آخر
کہ غارت ہوگئی تیری خوشی کی انجمن آخر

زمانہ نے لباسِ بیوگی پہنا دیا تجھ کو
مسرت زار سے غمخانہ میں پہنچا دیا تجھ کو

نگاہوں سے تصور اک نیا پردہ اُٹھاتا ہے
تجھے ملکہ بنا کر قصرِ شاہی میں بلاتا ہے

جہانگیر اک طرف مصروف ہے صہبا پرستی میں
لگائے ساغرِ مے لب سے ہے سرشار مستی میں
اُدھر مشغول ہے تو انتظامِ ملک و دولت میں
امورِ سلطنت میں اور مہماتِ سیاست میں
کچھ اس انداز سے چھیڑا حکومت کے ترانے کو
شہنشہ کی ضرورت ہی نہیں گویا زمانے کو

یہ نیرنگِ تصور ہے کہ اک خوابِ پریشاں ہے
فضائے شاہدرہ میں جیسے تو اب بھی خراماں ہے

جلو میں تیری کمسن لڑکیاں زہرہ شمائل ہیں
زمیں کو آنکھوں آنکھوں میں اُلٹ دینے پہ مائل ہیں
بلا کی شوخیاں ہیں ان پری وش نازنینوں میں
کسی نے بجلیاں بھر دی ہیں گویا آبگینوں میں
یہ کمسن حُسن کی چڑیاں مگن ہیں رنگ رلیوں میں
کہ تیرے سحر لب سے پڑ گئی ہے جان کلیوں میں
برس جاتی ہیں پنکھڑیاں وہ جس دم بات کرتی ہیں
لبوں کی سُرخ قینچی سے ہزاروں گُل کترتی ہیں

یکایک دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدلتا ہے
نیا عالم نکلنے پر نیا عالم نکلتا ہے

اِدھر تُو اور جہانگیر اک طرف خاموش بیٹھے ہیں
شرابِ عشق سے سرشار اور مدہوش بیٹھے ہیں
ترے ہاتھوں میں اک زرّیں جامِ نور افشاں ہے
کہ آغوشِ سحر میں ایک خورشیدِ درخشاں ہے
کبھی تو بھر کے ساغر اپنے ہاتھوں سے پلاتی ہے
کبھی حالت پہ اس کی دل ہی دل میں مسکراتی ہے
عبث دنیا میں کیوں بدنام اُس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور وہ کچھ اور مستی ہے
وہ مستی کیا ہے تیرے دیدۂ میگوں کی سرشاری
یہیں سے ملتی رہتی ہے اُسے تعلیم میخواری

تخیل اس نظر آباد میں کروٹ جو لیتا ہے

تصور ہاتھ سے ماضی کا دامن چھوڑ دیتا ہے

تو میں ہوتا ہوں تنہا اور تیری قبر ہوتی ہے
دلِ غم آشنا کو جستجوئے صبر ہوتی ہے

اسی حالت میں اپنی آنکھ سے موتی لٹاتا ہوں
تری سرکار میں کچھ قصے کچھ بھرے نغمے سناتا ہوں

تری راتیں ابھی تک سو رہی ہیں سبزہ زاروں میں
تری باتیں ابھی تک گونجتی ہیں جوئباروں میں

نہیں دیکھا کبھی تاریخِ ہستی نے خدائی میں
کہ شوہر کی جگہ بیوی نے لی فرمانروائی میں

تری خوشبو مہکتی ہے ابھی تک غنچہ زاروں میں
ترے نغمے مچلتے ہیں ابھی تک آبشاروں میں

سپہرِ حکمرانی کا تجھے ماہِ مبیں کہیئے
حکومت کی جہاں افروز خاتم کا نگیں کہیئے

تجھے باغِ حرم کی بلبلِ رنگیں نوا کہیئے
تجھے فطرت کی اک محبوبۂ شیریں ادا کہیئے

تو جانِ عاشقی، کانِ وفا، شانِ حکومت تھی
تری سب سے بڑی توصیف یہ ہے ایک عورت تھی

ہوئی مر کر بھی خوابیدہ تو شوہر ہی کے پہلو میں
جگہ پائی جہانگیرِ ابنِ اکبر ہی کے پہلو میں

ہزاروں پھول کھل جاتے ہیں جس دم لالہ زاروں میں
جب آجاتی ہے بارش سے روانی جوئباروں میں

غرض دنیا میں اک اک رسم جس دم رنگ لاتی ہے
زمینِ شہدرہ تیرے لئے آنسو بہاتی ہے

ایک سہیلی کی یاد میں

(سسرال میں)

گھر کے دھندوں سے ذرا فرصت اگر پاتی ہوں میں
اچھی حسن آرا ترے خوابوں میں کھو جاتی ہوں میں

اس نئی دنیا میں جس دم یاد آجاتی ہے تو

دو گھڑی کو اور سب کچھ بھول سا جاتی ہوں میں

آنکھ میں پھر جاتے ہیں بچپن کے وہ میٹھے سمے

اور اُن کے دلنشیں جلوؤں میں کھو جاتی ہوں میں

وہ رضیہ، خالدہ اور صادقہ کی صحبتیں!

آج جن کے دیکھنے کو بھی ترس جاتی ہوں میں

اور ہاں لو، کیسی بھولی ہوں، مری زہرہ بتول

جس کی شوخی یاد کر کے اب تڑپ جاتی ہوں میں

یاد آتا ہے وہ جانا سوئے مکتب ساتھ ساتھ

اک خوشی سی اب بھی دل میں موجزن پاتی ہوں میں

الغرض تنہائی میں جب یاد آ جاتی ہو تم

پھر سے اس بچپن کی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں میں

تو نے لیکن بے مروت خط تلک بھیجا نہیں

جب خیال آتا ہے دیوانی سی ہو جاتی ہوں میں

روز کہتی ہوں کہ اب آتا ہے حسن آرا کا خط

روز لیکن ناامیدی کی خبر پاتی ہوں میں

تجھ سے ایسی بیوفائی کی کسے امید تھی

آسماں کو دیکھ کر خاموش رہ جاتی ہوں میں

نوج کوئی اپنے دل کو اس طرح پتھر بنائے

جس میں اک ذرہ بھی نرمی کا نہیں پاتی ہوں میں

جمع ہو جاتی ہیں جس دم پیار ملنے والیاں
تیری صحبت یاد کر کے سُن سی ہو جاتی ہوں میں

کھانا بھاتا ہے نہ پینا جب سے تجھ سے دور ہوں
خونِ دل پیتی ہوں میں لختِ جگر کھاتی ہوں میں

جانتی ہوں تیرا پیارا خط نہ آئے گا کبھی
ہائے اس نادان دل کو پھر بھی سمجھاتی ہوں میں

روز کے صدموں سے تنگ آ کر بھلا تو دوں تجھے
لیکن اپنے دل پہ کچھ قابو نہیں پاتی ہوں میں

تیری فرقت میں کسی پہلو نہیں آتا ہے چین
گرچہ اس کمبخت دل کو لاکھ سمجھاتی ہوں میں

اور کچھ کہنا نہیں عذرا یہ بتلا دے مجھے
اے مِری حُسن آرا کبھی تجھ کو بھی یاد آتی ہوں میں

انجام ہستی

غرض وہ کچھ بھی ہے اک نوجوان عورت ہے
کمالِ صنعتِ فطرت کی جان عورت ہے

وہ اس طرب کدے میں سیر کرنے آئی تھی
بہارِ گُل کی کشش گھر سے کھینچ لائی تھی

نگاہیں کر رہی تھیں جذبِ کیفِ منظر کو
کہ اُس نے دیکھ لیا ایک کاسۂ سر کو

اور اب کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھتی ہے اسے
عجیب دیدۂ عبرت سے دیکھتی ہے اسے

ادھر ہوائے نوا ریز شور کرتی ہے

اُدھر وہ دل میں کچھ اس طرح غور کرتی ہے

کہ یہ نہ جانے کس انساں کا کاسۂ سر ہے؟ — الٰہی کس قدر اندوہناک منظر ہے

پڑا ہے خاک پہ نام و نشاں کچھ بھی نہیں — عزیز، دوست، مکان جسم و جان کچھ بھی نہیں

شباب و حسن پہ ہوگا کبھی غرور اُسے — شرابِ عیش کا ہوگا کبھی سرور اسے

مگر اب اس میں وہ پہلی سی کوئی بات نہیں — جہاں میں آہ! کسی چیز کو ثبات نہیں

نصیب تھے کبھی زرّیں پیرہن اس کو — ملا نہ بعد فنا ایک گز کفن اس کو

مرا بھی ایک دن ایسا ہی حال ہونا ہے — مجھے بھی اس کی طرح پائمال ہونا ہے

یہ جسم جس میں شباب آج لہلہاتا ہے — یہ جسم جس کو حجاب آج گدگداتا ہے

یہ آنکھیں جن میں جواں مستیاں جھلکتی ہیں — یہ ہونٹ جن میں شرابیں پڑی چھلکتی ہیں

خدا ہی جانے کہ کل ان کا حال کیا ہوگا؟ — مجھے خبر نہیں میرا مآل کیا ہوگا

کہاں نہیں ہے فنا اور کہاں نہیں ملتی — کسی کو زندگیٔ جاوداں نہیں ملتی

زمانہ کیا ہے تخیل کا کارخانہ ہے — مصورانِ فنا کا نگارخانہ ہے

نمودِ گل سے بھی ناپائدار ہے دنیا — طلسم خانۂ برق و شرار ہے دنیا

قیام دہر کی حالت حباب کی سی ہے — ہماری زندگی اک مست خواب کی سی ہے

جہاں کے رنج و تعب راحت و طرب فانی

فقط خدا کو بقا، اور باقی سب فانی

○

عورت اور پھول

عورت :

معطّر ہو رہی ہے کل فضائے گلستاں تجھ سے
منوّر ہو رہا ہے ظلمت آباد جہاں تجھ سے
طلوعِ ماہ ہو جس طرح تاریکیٔ صحرا میں
یونہی سرمست و روشن ہے حریمِ بوستاں تجھ سے
مگر او پھول مجھ کو دیکھ کر شاعر یہ کہتے ہیں
کہ میرے یاسمیں لب ہیں سراسر ارغواں تجھ سے
بتا کیا تجھ میں بھی ہے جلوہ پیرا ایسی شادابی
جو بحرِ رنگ و بو کی موج بن کر ہے عیاں تجھ سے
مری صورت سے بھی کیا ایسی ہی شوخی ٹپکتی ہے
جو ہے سیلِ بہار و تازگی بن کر رواں تجھ سے

پھول

یہ سن کر پھول نے اپنی زبانِ بے زبانی سے
کہا "اے رونقِ بزمِ بہارِ گلستاں تجھ سے
سپہرِ نیلگوں پہ ہیں ستارے مدح خواں تیرے
فضائے باغ میں ہے موجِ بوئے گل رواں تجھ سے
نوائے زہرہ گم ہے تیرے نغموں کی فضاؤں میں
نزاکت سیکھتا ہے خندۂ حورِ جناں تجھ سے

ترے خوابوں میں تارے رات بھر رقصاں رہتے ہیں
گلستاں میں ہے آغوشِ سحر نکہت فشاں تجھ سے

اُفق پر صبح کی پہلی کرن جب مسکراتی ہے
سبق لیتی ہے بیداری کا روحِ گلستاں تجھ سے

ترے گیسوئے مشکیں، موجِ نکہت کے شبستاں ہیں
مہکتی ہے فضائے سادہ آبادِ جہاں تجھ سے

کہاں میں اور کہاں تو، ذرہ میں مہرِ درخشاں تو
جو امرِ واقعی ہے میں وہ کرتا ہوں بیاں تجھ سے

تری صورت تو مجھ سے بڑھ کے شادابی کا پیکر ہے
بجا ہے گر ہو شرمندہ بہارِ گلستاں تجھ سے

مجھے اس پر ہزاروں افتخار و ناز ہیں سلمیٰ
کہ نسبت دے رہی ہے مجھ کو شاعر کی زباں تجھ سے

نویدِ عید

فلک پر پھر ہلالِ عید محوِ نور باری ہے
فضائے دیر پر اک جلوۂ مستانہ طاری ہے

افق پر نکہت و مستی کا اک طوفان برپا ہے
بہارِ رنگ و بو کا چار سو ہیجان برپا ہے

ہلالِ عید کی آغوش میں اک حور بیٹھی ہے

حریم نزد میں گویا اک عروس نو نہ بیٹھی ہے

وہ نغمہ چاہتی ہے جس سے دنیا مست ہو جائے

اور اُس کی مستیوں میں محفلِ آفاق کھو جائے

ملی ہے نو بہارِ عیش و عشرت کی نوید اس کو

اور اس دنیائے غم میں کہتے ہیں لیگ عید اس کو

شوہر کے تابوت پر

خاک میں چھپ جائے گی صورت تمہاری ہائے ہائے

میری قسمت میں لکھی تھی یہ بھی خواری ہائے ہائے

آسماں او آسماں! بیدرد کچھ انصاف کر

یہ دلِ نازک مرا یہ زخم کاری ہائے ہائے

کس لئے مرجھا گئے ہنستے ہوئے ہونٹوں کے پھول

مرنے والے کیا ہوئی وہ لالہ کاری ہائے ہائے

داغِ دل کس کو دکھائیں، دردِ دل کس سے کہیں

کون سُنتا ہے جہاں میں آہ وزاری ہائے ہائے

شمعِ تربت کی طرح اے کاش میں بھی جل بجھوں

تیرے غم سے کس قدر ہے شرمساری ہائے ہائے

○

لیلائے شب

چمن میں لیلائے شب، ہواؤں کی گود میں سوتی آرہی ہے
بہار کے خوابِ ناز کا خوشگوار پیغام لارہی ہے
سیاہ ساڑی پہ سینکڑوں زرفشاں ستارے جڑے ہوئے ہیں
جو اس کے گلفام جسم کو اپنی ظلمتوں میں چھپارہی ہے
جبیں پہ خاموش اک تبسم، لبوں پہ مدہوش اک ترنم
کہ جیسے کوئی کلی ہواؤں کی چھیڑ سے مسکرا رہی ہے
غرض یونہی سوتی اور سُلاتی، نشے پلاتی، ترانے گاتی
ہوا کی پریوں کے ساتھ اپنی سواری آگے بڑھا رہی ہے
سرک کے چہرے سے اُس کا آنچل کمر تلک کھل کے اُڑ رہا ہے
حیا کی تاثیر گھٹ رہی ہے برہنگی بڑھتی جارہی ہے
جو کھل گئی پوری ساری لے لے گا گود میں آفتاب اس کو
سنہری کرنوں کی روشنی کا ملے گا زرّیں حجاب اس کو

اندھی لڑکی

آسماں پر ہیں گھنیری بدلیاں چھائی ہوئی
نیلگوں پریاں اُڑی جاتی ہیں گھبرائی ہوئی
اس بہارستان کے دامن میں ہے محوِ خرام

ایک محرمِ نظر، دوشیزہ گھبرائی ہوئی

سینہ پر معصومیت کا نور، مہتاب آفریں
چہرہ پر دوشیزگی کی سُرخیاں چھائی ہوئی

سینہ و بازو پہ عریانی کے جلوے موجزن
شانہ و گردن پہ کافر زلف لہرائی ہوئی

ایک لکڑی کے سہارے ہاتھ میں پانی لئے
آ رہی ہے ساحلِ دریا سے گھبرائی ہوئی

پاؤں رکھتی ہے کہیں جلدی میں پڑتا ہے کہیں
سبزہ پر پھلی ہوئی ٹھوکر سے گھبرائی ہوئی

راستے میں سوچتی جاتی ہے دل ہی دل میں یوں
مجھ پہ فطرت کی یہ کیسی ظلم فرمائی ہوئی

اک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں
چار سو ہے دُھندلی دُھندلی سی گھٹا چھائی ہوئی

آہ لیکن یہ ہوا، یہ شام کی ٹھنڈی ہوا
کہہ رہی ہے جنگلوں پہ ہے بہار آئی ہوئی

آ رہی ہے ہر طرف سے مست خوشبو کی لپٹ
وادیاں قدرت نے ہیں پھولوں سے مہکائی ہوئی

کاش میں بھی دیکھ سکتی یہ مناظر ایک بار
سبزہ و گل کی ہے کیا کچھ محفل آرائی ہوئی

رات دن، شام وسحر یکساں ہیں سب میرے لیے

اک سیاہی سی ہے ہر دم ہر طرف چھائی ہوئی

سُنتی ہوں یہ محفلِ ہستی بہت دلچسپ ہے

اس کے ہر ذرّے پہ ہیں رنگینیاں چھائی ہوئی

میں سمجھتی ہوں کہ ہر سُو اک دھوئیں کی نہر ہے

اور میں اُس میں تیرتی پھرتی ہوں گھبرائی ہوئی

ایک دن کے واسطے آنکھیں جو مل جائیں مجھے

تو وہ سب کچھ دیکھ لوں جس کی ہوں ترسائی ہوئی

میرے مالک! رحم! مجھ کو میری آنکھیں بخش دے

مجھ سے غافل کیوں تری شانِ مسیحائی ہوئی

الغرض وہ اس طرح کی آرزو دل میں لیے

جا رہی ہے اپنے گھر کی سمت گھبرائی ہوئی

پہلا خط

(ایک بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے نام)

لیلائے رازِ شوق کا محمل ہے ہات میں
یعنی بجائے خامہ مرا دل ہے ہات میں

احوالِ دل لکھوں خلشِ مدّعا لکھوں
رُکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں

دل اپنی دھڑکنوں کو چھپا جائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح

لکھنے کو تو میں لکھتی ہوں تم کو ہزار خط
لکھ لکھ کے پھاڑ دیتی ہوں پر بار بار خط

گستاخی کا خیال گر آئے تو کیا کروں
دل شرم سے جو بات دبائے تو کیا کروں

خط کے خیال نے مجھے تم سے ملا دیا
اور میری بے خودی پہ قلم مسکرا دیا

پہلے پہل کی مشق کو مجبور جانئے
بے ربطیٔ خیال کو معذور جانئے

مجھ سے بیانِ شوق کو ظاہر کیا بھی جائے
لکھنے کا حوصلہ ہے مگر کچھ لکھا بھی جائے

کیا میری بیخودی کا پتہ پا گیا ہے کچھ
کاغذ سے جھک کے میرے قلم نے کہا ہے کچھ

کر جائے گا خفا کہ ہنسا جائے گا یہ خط
اللہ اکس نظر سے پڑھا جائے گا یہ خط

پہلے پہل کے خط میں، میں کیا ماجرا لکھوں
کہہ دو یہ کیا لکھا ہے میں کہتی ہوں کیا لکھوں

طاری جو اک ہجومِ خیالات دل پہ ہے
اک ہات میں قلم ہے اور اک ہات دل پہ ہے

بازی گاہ ہستی

یہ دنیا جو عدم کی خاک کے پتلوں کی بستی ہے
حقیقت میں اگر دیکھو تو بازی گاہ ہستی ہے

جو تازہ وارد اس بازیچۂ رنگیں میں آتا ہے
دماغی روشنی میں اک نہ اک بازی لگاتا ہے

مصنف اپنے ہیجانِ قلم سے کام لیتا ہے
سپاہی اپنی شمشیرِ دو دم سے کام لیتا ہے

ہر اک کی دماغی طاقتیں ہوتی ہیں صرف اس میں
مقنن کو بنانے پڑتے ہیں کچھ خاص حرف اس میں

اطبا سارے اگلے پچھلے نسخے یاد کرتے ہیں

مریض اپنے ہر اک آرام کو برباد کرتے ہیں

شرابی ناصیہ سائے درِ پیرِ مغاں ہو کر

مؤذن بادلِ ناخواستہ، محوِ اذاں ہو کر

معلم چند پارینہ کتابوں پر نظر رکھ کر

وکیل از یاد رفتہ چند جرموں کی خبر رکھ کر

کسان، ابر و ہوا کے ساتھ محنت کی نمائش سے

بہادر جنگ میں جوشِ شجاعت کی نمائش سے

غرض بازیچۂ دنیا میں جو سیاح آتا ہے

یونہی ہر ایک اپنی اپنی بازی کھیل جاتا ہے

عورت

حیات و حرمت و مہر و وفا کی شان ہے عورت

شباب و حسن و انداز و ادا کی جان ہے عورت

حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت

جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت

اگر عورت نہ آتی کل جہاں ماتم کدہ ہوتا!

اگر عورت نہ ہوتی ہر مکاں اک غم کدہ ہوتا!

یدِ قدرت میں اک چلتی ہوئی شمشیر ہے عورت

زمیں پر فطرتِ معصوم کی تصویر ہے عورت

جہاں میں کرتی ہے شاہی مگر لشکر نہیں رکھتی

دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی

کہیں معصوم طفلی اس کے نغموں سے بہلتی ہے

کہیں بیخود جوانی اس کے نوشِ لب سے پگھلتی ہے

کہیں مجبورِ پیری اس کی باتوں سے سنبھلتی ہے

کہیں آرام سے جاں اسکے قدموں پر نکلتی ہے

نہیں ہے کبریا لیکن یہ شانِ کبریائی ہے

ہماری ساری پیاری عمر پر اس کی خدائی ہے

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے

وہ ہنستی ہے تو فطرت بیخودی سے مسکراتی ہے

وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے

وہ اُٹھتی ہے تو کُل خوابیدہ دُنیا کو اُٹھاتی ہے

وہی ارمانِ ہستی ہے، وہی ایمانِ ہستی ہے

بدن کہیئے اگر ہستی کو تو وہ جانِ ہستی ہے

وہ چاہے تو اُلٹ دے پردۂ دُنیائے فانی کو

وہ چاہے تو مٹا دے جوشِ بحرِ زندگانی کو

وہ چاہے تو مٹا دے نخل زارِ حکمرانی کو

وہ چاہے تو بدل دے رنگِ بزمِ آسمانی کو

وہ کہہ دے تو بہارِ جلوہ مٹ جائے نظاروں سے
وہ کہہ دے تو لباسِ نور چھن جائے ستاروں سے

ایک سہیلی کا پیغام

(دوسری کے نام)

کیوں نہ رہ رہ کے اُٹھے دل سے فغاں تیرے بغیر
میری عذرا دشمنِ جاں ہے جہاں تیرے بغیر

باغ صحرا بن گئے اور پھول کانٹے ہو گئے
جنتِ لاہور ہے وقفِ خزاں تیرے بغیر

پیاری عذرا دور ہی سے اک نگاہِ التفات
کر رہا ہے ظلم ہم پہ آسماں تیرے بغیر

کون لے جائے ہمیں تیری طرح اصرار سے
کون جائے بہرِ سیرِ گلستاں تیرے بغیر

چاندنی راتوں میں جاتے ہیں پہاڑی پہ مگر
کاٹے کھاتا ہے پہاڑی کا سماں تیرے بغیر

پچھلے وعدے یاد کر پچھلی وفائیں یاد کر
بے نواکب تک رہوں محوِ فغاں تیرے بغیر

چاک ہونے کو ہے دامانِ بہارِ زندگی
تاک میں ہے خارِ مرگِ ناگہاں تیرے بغیر

وادیٔ سرحد کے اوغجیم سیاحت آشنا

زندگی ہے ایک خواب رائگاں تیرے بغیر

میری عذرا سے خدارا کوئی اتنا جا کہے

ہو رہے ہیں مہرباں، نامہرباں تیرے بغیر

بے مروت! اتو نہ بھیجے بھول کر بھی خط کبھی

اور جدائی کی سہیں ہم سختیاں، تیرے بغیر

دن کو ہیں بے تابیاں، راتوں کو ہیں بے خوابیاں

مر مٹے تیرے بغیر! اے جانِ جاں تیرے بغیر

چاندنی راتوں میں مغل شہزادیوں کی چوگان بازی

فضائے دہلی پہ ماہِ تاباں بساط سیمیں بچھا رہا ہے

کہ آسماں سے کوئی فرشتہ زمیں پہ موتی لٹا رہا ہے

جگہ جگہ آسمان پر خوشنما ستارے جڑے ہوئے ہیں

ادھر کوئی جھلملا رہا ہے اُدھر کوئی جگمگا رہا ہے

ہواؤں کے ہلکے ہلکے نغمے کچھ اس ادا سے بکھر رہے ہیں

کہ جیسے کوئی تھکا ہوا گانے والا کچھ گنگنا رہا ہے

وہ دیکھو! چوگان بازی میں محو مغلیہ شاہزادیاں ہیں

جو دیکھ لے شاعر ان کے چہرے تو بول اُٹھے ماہزادیاں ہیں

ہوا میں تیزی سے اس طرح اپنا اپنا گھوڑا بڑھا رہی ہیں

کہ جیسے پریاں زمیں سے اُڑ کر دیارِ انجم کو جا رہی ہیں

پڑی ہے سبزہ کے فرش پر ایک بلگجی گیند جس کے پیچھے
وہ اپنے گھوڑے اڑا رہی ہیں ادا سے چوگاں بڑھا رہی ہیں

یہ گیند ہے یا اُبھر رہا ہے حسین چہرہ پہ تل کسی کا
کہ گر پڑا ہے مچل کر اُن کی سیاہ زلفوں سے دل کسی کا

○

شہناز

چھٹا مجموعۂ کلام

شہناز

پہلا خط

اُس شوخ نے لکھا ہے ہمیں پہلی بار خط
جس پہ فدا ہزار نہیں، سو ہزار خط

ظالم نہیں یہ اُن کی طرح سنگدل نہیں
سینے سے آ لگا مرے، بے اختیار خط

یہ پھول ہے کہ پھول سے عارض کا عکس ہے
یکسر بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط

کس نازنیں کے ہاتھ کا پرتو ہے کیا کہوں
یہ خط یہ دلفریب خط اور عطر بار خط

ہر لفظ میں چھپی ہیں ہزاروں لطافتیں
کس نازنیں سے عشق کا ہے راز دار خط

ایک ایک حرف دل میں سما جائے ناز سے
پڑھتا ہوں اس لئے میں ترا بار بار خط

بیداریوں پہ بھی ہے گماں مجھکو خواب کا
یہ آنکھیں اور یہ مرے پروردگار خط

یہ سوز و ساز آہ۔ یہ جذبِ گداز ہائے
یہ بیقرار لفظ، یہ سینہ فگار خط

اختر کے آنسوؤں کی دعائیں قبول کر
اے اس کے دردِ عشق کے آئینہ دار خط

کئی دن سے

آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے
دیکھا نہیں وہ چہرۂ خنداں کئی دن سے

افسردہ ہے روحِ چمنستاں کئی دن سے
ناشاد ہیں سرو گل و ریحاں کئی دن سے

غم خانہ ہے نظروں میں گلستاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

میں ڈھونڈتا ہوں جس کو وہ مہ پارہ کہاں ہے؟
وہ جنتِ انوار کا نظارہ کہاں ہے؟
شادابی و نکہت کا وہ گہوارہ کہاں ہے؟
میری شبِ اذکار کا سیارہ کہاں ہے؟

محرومِ ضیا کیوں ہے شبستاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

حیراں ہوں مرے سروِ خراماں کو ہوا کیا؟
اُس شمعِ شبستانِ دل و جاں کو ہوا کیا؟
تشنہ ہے فضا جلوۂ جاناں کو ہوا کیا؟
بیتاب ہیں گلُ، اُس گلِ خنداں کو ہوا کیا؟

ناراض ہے کیوں وہ گلِ خنداں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

کیا بات ہوئی کیوں وہ فلکِ ناز نہ آئی؟
وہ شوخ ادا، حورِ فسوں ساز نہ آئی؟
وہ پیکرِ مہ، ہیکلِ اعجاز نہ آئی؟

ویراں ہے شبستاں کوئی آواز نہ آئی!

کیوں دور ہے وہ ماہِ خراماں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

وہ جانِ چمن، روحِ چمن زار کدھر ہے؟
وہ لعل حسین و رُخِ گلنار کدھر ہے؟
بے تاب ہے دل صورتِ دلدار کدھر ہے؟
مضطر ہے نظر، جلوۂ گلکار کدھر ہے؟

لہرائے نہیں کاکلِ رقصاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

انتظارِ دعوت

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟
روٹھی ہوئی اُمید کو کب تک مناؤ گی؟
کس دن بہارِ چہرۂ گلگوں دکھاؤ گی؟
کس رات ابرِ زلف سے بجلی گراؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

کب تک پھریں گے غمزدہ شہر و دیار میں
بھٹکیں گے کب تلک چمن و سبزہ زار میں
روئیں گے پھول دیکھ کے کب تک بہار میں

تم اپنے عارضوں کی جھلک کب دکھاؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

ہیں شہر میں کبھی، کبھی ویرانے میں قیام

صحرا میں ہیں کبھی، کبھی کاشانے میں قیام

مسجد میں ہیں کبھی، کبھی بُت خانے میں قیام

تم اپنا آستاں ہمیں کس دن بتاؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

دل میں جو تھے اُمید کے سامان مٹ چلے

شاداب آرزوؤں کے طوفان مٹ چلے

دل کیا مٹا کہ دل کے سب ارمان مٹ چلے

کملا رہے ہیں پھول انھیں کب تک کھلاؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

پھر وادیوں میں ایسی ہوائیں نہ آئیں گی

چشموں کی دھیمی دھیمی صدائیں نہ آئیں گی

کہسار پر یہ مست گھٹائیں نہ آئیں گی

ان قیمتی نظاروں کو کب تک لٹاؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

دن رات ہے پیامِ محبت کا انتظار

آنکھیں ہیں اور نامۂ شیریں کا انتظار

اُف انتظار اور قیامت کا انتظار
کب تک یہ انتظار کی کلفت مٹاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

عزمِ رنگیں

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا
چپکے سے خواب گاہ کے پردے اٹھاؤں گا
دستِ صبا کی طرح تجھے گدگداؤں گا
اور تیرے پائے ناز پہ سجدے لٹاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

ہر چند راہ روکیں گے دیوار و در ترے
آنے نہ دیں گے باغ میں نخل و شجر ترے
چوموں گا دستِ نازنیں آ کر مگر ترے
دزدِ حنا کی طرح، تجھے گدگداؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو میرے پاس آنے سے معذور ہی سہی
میرا فراق بھی تجھے منظور ہی سہی
یہ بھی سہی کہ مجھ سے بہت دور ہی سہی
ان دوریوں کو، وصل کا عالم دکھاؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو محوِ خواب ہو گی شبستانِ ناز میں
آسودہ اپنی خلوتِ رنگیں طراز میں
مُنہ کو چھپائے سایۂ زلفِ دراز میں
سایہ سا بن کے میں بھی نظر میں سماؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

دیکھے گی خواب میں تو نظارے بہار کے
نظروں میں جگمگائیں گے تارے بہار کے
رقصاں لبوں پہ ہوں گے شرارے بہار کے
اور میں ترے لبوں سے شرارے چراؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

رخصت کے بعد

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم
میں نے اک لمحہ خوشی کا نہ گزارا ہمدم
چھن گیا میری امیدوں کا سہارا ہمدم
چھُپ گیا میرے شبستاں کا ستارا ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ رہتا ہوں دن رات اُداس

دل میں ہیں شعلہ فشاں رنج والم، حسرت و یاس
کوئی تسکین نہ تسلی، کوئی امید نہ آس
کر گئے ہجر میں سب مجھ سے کنارا ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم

میری وحشت کو بڑھاتی ہے چمن کی صورت
دل کو تڑپاتی ہے شمشاد و سمن کی صورت
یاد آجاتی ہے اُس غنچہ دہن کی صورت
بھولتی ہی نہیں نظروں سے یہ نظارا ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم

اُس کے جانے سے فضاؤں میں طراوت نہ رہی
باغ کا رنگ اُڑا، پھولوں میں نکہت نہ رہی
جلوہ زارِ مہ و انجم میں وہ طلعت نہ رہی
بجھ گیا سب کے مقدر کا ستارہ ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم

کبھی وحشت لئے پھرتی ہے خیابانوں میں
کبھی تکمیلِ جنوں ہوتی ہے ویرانوں میں
اور کبھی روتا ہوں جا کر شہر ستانوں میں
کہ چمن میں نہیں کوئی چمن آرا ہمدم

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم

نظامِ رنگیں

اُٹھا جام ساقی، جہاں کو بدل دیں — نظامِ زمین و زماں کو بدل دیں
پلا دے کچھ ایسی کہ ٹھوکر لگا کر — زمیں ہی نہیں آسماں کو بدل دیں
ضرورت ہے اک ساقیِ نوجواں کی — ہے موقع کہ پیرِ مغاں کو بدل دیں
وہی ایک منظر ہے صدیوں سے طاری — طلسمِ مہ و کہکشاں کو بدل دیں
کہاں تک یہ جانِ حزیں، جسمِ لاغر — اُٹھو ہیئتِ جسم و جاں کو بدل دیں
محبت، خوشی کا ترانہ ہے، کہہ دو — کہ عشاق طرزِ فغاں کو بدل دیں

خدائی کی ہر شے کو بدلیں ہم اخترؔ
یہاں تک کہ "اُس دلستاں" کو بدل دیں

طلوعِ بہار

پھر بہار آئی چمن میں پھول برساتی ہوئی
ہر قدم پر رنگ و بو کے زمزمے گاتی ہوئی
کان میں پھولوں کے آویزے کہ پریاں رقص میں
دوش پر بادل کہ زلفِ حور لہراتی ہوئی
فصلِ گل ہے یا کوئی دوشیزۂ رنگیں بدن
فرشِ گل سے صبح دم اُٹھی ہے شرماتی ہوئی
ہر نظر سے بادہ و مستی کی کیفیت عیاں

ہر ادا حسن و شباب و کیف برساتی ہوئی
اپنی زلفِ عطر آلودہ کی ہر جنبش کے ساتھ
حوریانِ یاسمین و گل کو مہکاتی ہوئی
مژدہ باد اے میکدہ، پھر دھوم سے آئی بہار
رخصت اے توبہ کہ پھر آفاق پر چھائی بہار

ساقی نامہ

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا، مری حالت خراب ہے ساقی

شباب کے لئے توبہ عذاب ہے ساقی
پلا شراب کہ پاسِ شباب ہے ساقی

چھلک رہا ہے یہ ساغر میں کس کا حسنِ شباب
یہ کون پردہ نشیں بے حجاب ہے ساقی

چھلک رہی ہے یہ ساغر میں تیری برقِ جمال
کہ میرا گم شدہ رنگیں شباب ہے ساقی

نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو
گھٹا میں کس لئے یہ ماہتاب ہے ساقی

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزام
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

چل اک بہشت بسائیں سرور و مستی کی
بہشتِ دہر تو غم سے خراب ہے ساقی

یہ کس کی یاد میں روتی ہے آج رہ رہ کر
گھٹا ہے یا مری چشمِ پرآب ہے ساقی

مجھے پسند ہے دنیا میں اپنی ناکامی
کہ ہر ذلیل یہاں کامیاب ہے ساقی

کلام جس کا ہے معراجِ حافظ و خیام
یہی وہ اخترِ خانہ خراب ہے ساقی

تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے

مجھے پیار کرنے والی تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے ؟
مری یاد میں تو ہردم، یونہی بے قرار کیوں ہے ؟
ترا رنگ زرد کیوں ہے ترا حال زار کیوں ہے ؟

تجھے اضطرار کیوں ہے ؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے ؟

ہیں ستارے سربسجدہ ترے پائے نازنیں پر
مہ و آفتاب قرباں ہیں جمالِ دلنشیں پر
ہے بہارِ خلد صدقے ترے روئے یاسمیں پر

ترا دل فگار کیوں ہے ؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے ؟

ترے غم کو نذر کیا دوں کہ گنوا چکا جوانی
کسی اور آستاں پر میں مٹا چکا جوانی
میں بھلا چکا محبت، میں لُٹا چکا جوانی

تو گلے کا ہار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

میں نثار کر چکا ہوں ہوسِ بتاں پہ عمریں
اسی دُھن میں صرف کر دی ہیں درِ مغاں پہ عمریں

کروں عذر اب کہاں سے ترے آستاں پہ عمریں

تو یوں سوگوار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

مجھے کیا خبر تھی اک دن تجھے مجھ سے پیار ہوگا
مری آرزو میں جینا تجھے ناگوار ہوگا
مری "غم نگاریوں" پہ ترا دل نثار ہوگا

ترا دل نثار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

غم عاشقی میں برسوں میں خراب ہو چکا ہوں
کئی بار دل دیا ہے کئی بار رو چکا ہوں
ترے غم کو کیا کروں اب، کہ غموں میں کھو چکا ہوں

ترا غم شعار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

مفارقت

حیراں ہے آنکھ، جلوۂ جاناں کو کیا ہوا؟
ویراں ہیں خواب، گیسوئے جاناں کو کیا ہوا؟
پردیس جا کے سُدھ ہی نہ لی اُس نے اے فراق
اُس کی جفائے زود پشیماں کو کیا ہوا؟

آنکھیں بدل رہی ہیں مری شامِ آرزو
کس سے کہوں کہ گردشِ دوراں کو کیا ہوا؟
طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اُس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہوا؟
روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں؟
اخترؔ خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا؟

شبہائے رفتہ

جب تمہاری یاد میں دیوانہ سا رہتا تھا میں
جب سکون و صبر سے بیگانہ سا رہتا تھا میں
بے پئے مدہوش سا مستانہ سا رہتا تھا میں
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

جب تمہاری جستجو بیتاب رکھتی تھی مجھے
جب تمہاری آرزو بے خواب رکھتی تھی مجھے
مثلِ موجِ شعلہ و سیماب رکھتی تھی مجھے
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

منتظر میری جب اپنے باغ میں رہتی تھیں تم
ہر کلی سے اپنے دل کی داستاں کہتی تھیں تم
نازنیں ہو کر بھی نازِ عاشقی سہتی تھیں تم

آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!

جب تم آجاتی تھیں، با زلفِ پریشاں تا کمر
عطر بیما تا بہ زانو، سنبلستاں تا کمر
"مشک آگیں تا بہ داماں عنبر افشاں تا کمر"

آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!

ایک تنہا مرغابی

کہاں بچھڑا ہے تجھ سے آہ تنہا کارواں تیرا؟
ہے کیوں ایک ایک نغمہ اس طرح ماتم چکاں تیرا؟
ہوا میں ایک آنسو بن کے کیوں لہرا رہی ہے تو؟

تری ہمجولیاں رخصت ہوئیں آخر کہاں تجھ سے؟
خفا کیوں ہو گیا اس طرح ظالم آسماں تجھ سے؟
فضا میں کس لئے آہ و فغاں برسا رہی ہے تو؟

ترے ناشاد نغمے سن کے غمگیں ہیں ستارے بھی
ہوا ساکت، فضا صامت، فسردہ ہیں نظارے بھی
اداسی ہی اداسی ہر طرف پھیلا رہی ہے تو؟

گئے وہ دن کہ برکھا کی ہوا تھی تیرا گہوارہ
نشیمن تھا ترا دریا، گھٹا تھی تیرا گہوارہ
اب اُن کی یاد میں کیوں نغمۂ غم گا رہی ہے تو؟

ترے ہم جنسوں کی اکثر صدائیں سُن چکا ہوں میں
شب مہتاب میں رنگیں نوائیں سُن چکا ہوں میں
مگر یہ اور ہی کچھ لے ہے جس میں گا رہی ہے تو!

کسی غمگین دل کی ہے دعائے راہ گم کردہ ؟
کہ اک فرقت زدہ کی التجائے راہ گم کردہ؟
کہاں سے آئی ، کس جانب بھٹکتی جا رہی ہے تو!

ترے ہمراہیوں کی بے وفائی کا مجھے غم ہے
میں سمجھا تھا یہ شیوہ قسمتِ اولادِ آدم ہے
جبھی اس چاندنی میں مجھ کو غمگیں پا رہی ہے تو!

شریکِ رنج و غم کوئی نہیں دنیا کی محفل میں
محبت ڈھونڈی نہ پائی ہم نے دلسوزی کسی دل میں
احبّا کے تصوّر سے مجھے تڑپا رہی ہے تو!

جسے دیکھا جہاں میں خود غرض اور بیوفا دیکھا
ذلیل و پست فطرت اور مطلب آشنا دیکھا
دلا کر یاد اُن کی ، آگ سی بھڑکا رہی ہے تو!

شہیدانِ جواں

دل کی گہرائی سے آوازِ فغاں آتی ہے
پھر مجھے یادِ شہیدانِ جواں آتی ہے

گُلبدنانِ خلد کے حیراں ہیں کہ یارب کیونکر
طرزِ آرائشِ گلگونِ کفناں آتی ہے

سرخرو، خونِ شہیداں سے ہے لاہور کی خاک ذرّے ذرّے سے ہمیں بوئے جناں آتی ہے

جذبۂ شوقِ شہادت کی کہوں کیا اختر

موت آتی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اُجڑے ہوئے پائیں باغ میں

(برسوں کی جلا وطنی کے بعد)

پھر کھڑا ہوں بادلِ سرشار پائیں باغ میں

پھر بپا ہیں حشر کے آثار، پائیں باغ میں

پھر لپٹتے ہیں گلے اشجار، پائیں باغ میں

دیدۂ غمگیں ہے پھر خونبار پائیں باغ میں

خوابِ طفلی ہو گیا بیدار، پائیں باغ میں

ہر شجر تھا اس کا اک دامنِ گل بداماں تا کمر

جھولتی تھیں گل رخانِ خلد ساماں تا کمر

کاکلِ پیچیدہ در پیچ، زلفِ رقصاں تا کمر

سب گلستاں تا بہ داماں، سنبلستاں تا کمر

پھول سے روشن کئے رخسار پائیں باغ میں

آج وہ حسنِ گل و رنگِ چمن باقی نہیں

نقشِ نسرین و نشانِ یاسمن باقی نہیں

نرگس و سوسن کا اندازِ کہن باقی نہیں

موتیا کا روپ، چمپا کی پھبن باقی نہیں
ہے فقط ریحاں جگر افگار، پائیں باغ میں

شاخِ گل کیسی کہ سایہ تک نہیں پاتے ہیں اب
ننھی کلیوں کے عوض سینے نظر آتے ہیں اب
چار سو صرصر کے جھونکے خاک برساتے ہیں اب
تتلیوں کے بدلے برگِ زرد لہراتے ہیں اب

اور بجائے گلُ، ہجوم خار، پائیں باغ میں

ایک دن ہر سمت 'امواجِ صبا تھیں رقص میں
شاخہائے نازک و رنگیں تب اتھیں رقص میں
حوریانِ غنچہ ہائے خلد زا تھیں رقص میں
ننھی ننھی تتلیاں بھی جابجا تھیں رقص میں

رقص میں تھا سایۂ اشجار، پائیں باغ میں

عہدِ طفلی اک دوامی لذتوں کا نام ہے
کیونکہ آغازِ جوانی اس کا نیک انجام ہے
جس کو کہتے ہیں جوانی موت کا پیغام ہے
بسکہ اس کا فاصلہ پیری تلک اک گام ہے

یہ سبق دیتے ہیں آج آثار پائیں باغ میں

یہ شجر وہ ہیں جو گود میں کھلاتے تھے مجھے
اپنے کندھوں پر محبت سے بٹھاتے تھے مجھے

میرے سر کو چومتے تھے، گدگداتے تھے مجھے
بوڑھے ہو کر جھولتے تھے اور جھلاتے تھے مجھے
میرے بچپن میں ہزاروں بار پائیں باغ میں

نالۂ مستانہ

محبت کی پذیرائی سے گر انکار ہے تم کو
تو تم "اختر" بنو، میں آپ کی "ریحانہ" بن جاؤں
غزل کیسی کہاں کی "نظم" لیکن مدعا یہ ہے
کہ تیرے لب تک آ کر نغمۂ مستانہ بن جاؤں
جوانی کے لئے ہے پارسائی ایک بیماری
میں کیوں آخر حریفِ نرگسِ مستانہ بن جاؤں
ترا مداح ہوں مجھ کو "رسالوں" سے غرض کیا ہے
میں غیروں کے لئے کیوں زینتِ کاشانہ بن جاؤں
کسی کی "گردن" اور "گیسو" کو جا کر چوم آتا ہے
مرے بس میں ہو گر اختر تو میں پروانہ بن جاؤں

یاد

پھر بہار آئی وہ فردوس لقا یاد آئی
پھر تصور کو وہ تصویرِ حیا یاد آئی

پھر کوئی لالہ رُخِ ہوش ربا یاد آئی
دیدۂ مست کی مستانہ ادا یاد آئی

پھر بہار آئی وہ فردوسِ لقا یاد آئی

نگہِ شوق نے ہر پھول کو پھر پیار کیا
کیفِ نظارہ نے ارمانوں کو بیدار کیا
پھر گھٹاؤں نے دل و روح کو سرشار کیا
زلفِ شب رنگ کی گلریز گھٹا یاد آئی

پھر بہار آئی وہ فردوسِ لقا یاد آئی

جس نے پہلے پہل افسانہ بنایا تھا مجھے
نگہِ ناز سے دیوانہ بنایا تھا مجھے
خوگرِ بادہ و پیمانہ بنایا تھا مجھے
پھر وہی مست نظر مست ادا یاد آئی

پھر بہار آئی وہ فردوسِ لقا یاد آئی

گل و گلزار پہ رقصاں ہے ہجومِ نکہت
نشہ سا بن کے پریشاں ہے ہجومِ نکہت
بیخود و مست و پرافشاں ہے ہجومِ نکہت
کیا کسی شوخ کی خوشبوئے حنا یاد آئی

پھر بہار آئی وہ فردوسِ لقا یاد آئی

○

مجھے لے چل

جہاں رنگیں بہشتیں کھیلتی ہیں سبزہ زاروں میں
جہاں حوروں کی زلفیں جھومتی ہیں شاخساروں میں
جہاں پریوں کے نغمے گونجتے ہیں کوہساروں میں
جوانی کی بہاریں تیرتی ہیں آبشاروں میں

مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

وہ دوشیزہ فضائیں جنتوں کا ہے گماں جن پہ
چھڑکتا ہے مئے تسنیم و کوثر آسماں جن پہ
لٹاتی ہے سحاب حسن و طلعت کہکشاں جن پہ
سرور و نور و نکہت لٹتے ہیں جن کے ستاروں میں

مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

جہاں شام و سحر نیلی گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
اُفق کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
فضاؤں میں بہاریں ہی بہاریں لہلہاتی ہیں
جہاں فطرت مچلتی ہے لچکتے ابر پاروں میں

مری سلمیٰ۔ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

جہاں آباد یہ ناپاک شہرستا نہیں ہوتے
فسادی، فتنہ پرور اور ذلیل انساں نہیں ہوتے
یہ انساں، ہاں یہ حیواں، بدتر از شیطاں نہیں ہوتے

فساد و شر سے جہاں سوتے ہیں خوابوں کے مزاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

بہشتوں کی لطافت ہے جہاں کی زندگانی میں
مزہ آتا ہے کوثر کا جہاں کے سادہ پانی میں
خدائی حسن عریاں ہے جہاں کی نوجوانی میں
صداقت کروٹیں لیتی ہے سازِ دل کے تاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

سپاہی سے خطاب

عجیب رنگ بدلتا ہے چرخِ فتنہ شعار
کہ ایک دن کو ہے امن اور چار دن پیکار
اسی روش پہ ہے وقتِ جہاں کا دار و مدار
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار

زمانہ پھر نئے فتنے اٹھانے والا ہے
ہوا بتاتی ہے طوفان آنے والا ہے
وہی ہے مرد جو ہر حال میں رہے تیار
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار

قیامت آئے کہ فتنے اٹھیں خیال نہ کر
سپاہی ہے تو کچھ اندیشۂ مآل نہ کر

کہ موت کہتے ہیں جس کو وہ آتی ہے اک بار

مرے سپاہی، ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار

نغمۂ امن

جان جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہمدم

دشمنِ ملک کو تو بے سروساماں کر دیں

نغمۂ حبِ وطن گائیں اِس انداز سے ہم

کہ نوا کاریٔ زہرہ کو پشیماں کر دیں

جنگ کا ولولہ پیدا کریں اس صورت سے

کہ فسوں سازیٔ مریخ کو حیراں کر دیں

محفلِ فتح میں صہبا کی ضرورت نہ رہے

خونِ اعدا کو کچھ اس طرح سے ارزاں کر دیں

غزلیات

رات بھر اُن کا تصور، دل کو تڑپاتا رہا

ایک نقشہ سامنے آتا رہا جاتا رہا

سب نہ ملنے تک کی باتیں تھیں، جب آ کر مل گئے

سارے شکوے مٹ گئے سارا گلہ جاتا رہا

ان لبوں کو ہی نہ تھا گستاخیوں کا حوصلہ
ہم نے مانا عمر بھر وہ ہم کو ترساتا رہا
اُس حریم ناز کا اب تک نہ پایا کچھ پتا
مدتوں، کم بخت دل گلیوں میں بھٹکتا رہا
محفلِ جاناں میں سب کو اپنی اپنی فکر ہے
کوئی اختر سے بھی پوچھے تیرا کیا جاتا رہا

○

ہُوا زمانہ کہ اُس نے ہم کو نہ بھول کر بھی سلام بھیجا
مزاج پوچھا، نہ حال لکھا، نہ خط، نہ کوئی پیام بھیجا
بہارِ اُمید چھا رہی ہے بہشتِ دل لہلہا رہی ہے
یہ پھول کیوں اُس نے خط میں رکھ کر ہمیں بایں اہتمام بھیجا
نگاہ اختر نے کہہ دیا کیا کہ جا چھپا ساقیٔ دلارا
نہ بادۂ مشکبو عطا کی، نہ ساغرِ لالہ فام بھیجا

○

ستانے لگا ہے طرح پھر زمانہ	ذرا ساقیہ، ساغرِ مے تو لانا
ہمارا معتدز نہ بدلا نہ بدلا	بدلتا رہا رنگ لاکھوں زمانہ

عجب بزم ہے بزمِ ہستی بھی اختر
نہ بیگانہ کوئی نہ کوئی یگانہ

○

کس لئے تنہا چلی آئی بہار
ساتھ اُن کو کیوں نہیں لائی بہار

جب بہارِ نوجوانی مٹ چکی
میرے کاشانے میں تب آئی بہار

لالہ و نرگس کی آنکھیں کھل گئیں
دیکھ کر اُن کو جو شرمائی بہار

جب نہ اُس رنگیں ادا کو لا سکی
اختر اپنے ساتھ کیا لائی بہار

○

اُن کو بلائیں اور وہ نہ آئیں تو کیا کریں؟
بیکار جائیں اپنی دعائیں تو کیا کریں؟

مانا کہ سب کے سامنے ملنے سے ہے حجاب
لیکن وہ خواب میں بھی نہ آئیں تو کیا کریں؟

ہم لاکھ قسمیں کھائیں نہ ملنے کی سب غلط
وہ دُور ہی سے دل کو لبھائیں تو کیا کریں؟

ناصح ہماری توبہ میں کچھ شک نہیں مگر
شانہ ہلائیں آکے گھٹائیں تو کیا کریں؟

میخانہ دُور، راستہ تاریک، ہم مریض
منہ پھیر دیں اُدھر جو ہوائیں تو کیا کریں؟

پلائے جا، پیے جا خوب ساقی — کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی
جہاں کی لذتوں سے تھک چکا ہوں — نہیں کوئی تمنا دل میں باقی
چھلک جائے نہ مینائے دو عالم — ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی

○

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو، کریں گے پاسِ شباب پہلے
حساب ہوتا رہے گا یا رب ہمیں منگا دے شراب پہلے
زباں پہ آیا نہ حرفِ مطلب کہ کہہ گئیں کچھ شریر نظریں
سوال کرنے نہ پائے ہیں ہم کہ مل گیا ہے جواب پہلے
جناں میں پہلے پہل پیئے گا تو لڑکھڑاتا پھرے گا زاہد
سرورِ کوثر کی ہے اگر دھن، جہاں میں پی لے شراب پہلے
ہے خسروِ عشق کا یہ فرماں، کہ دل لگانا نہیں ہے آساں
جسے ہو کوئے بتاں کا ارماں، ہو وہ کو بکو ہو خراب پہلے
غم و الم، رنج و یاس و حسرت، اٹھاؤں گا سب کے رخ سے پردے
تمہیں قسم ہے دلِ حزیں کی، اٹھاؤ تو تم نقاب پہلے
نگاہِ ساقی کی مسکرائی، کہا جب اختر نے اپنی دھن میں
پئیں گے، پیتے رہیں گے میکش، مگر یہ خانہ خراب پہلے

○

حسرتوں سے دل کا دامن بھر چلے
ہائے اس دنیا میں ہم کیا کر چلے

کب تلک یہ رنج و غم درد و الم

زندگی او زندگی ہم مر چلے

مختصر صحبت ہے ساقی جلد جلد

جام اُٹھے، مینا بڑھے، ساغر چلے

مطربہ! نغمہ، کہ دل گھبرا گیا

ساقیہ! ساغر کہ غم سے مر چلے

○

شاید کہ دیکھے ہیں لب شیریں دہن کے پھول

کیوں آج مسکراتے ہیں سارے چمن کے پھول

کیوں عارضوں کا رنگ اُڑا عرضِ شکوہ پہ

نسریں کے پھول بن گئے کیوں یاسمن کے پھول

اُس پیکرِ بہار کی کیا بات ہے ندیم

چھو لے اگر تو سرو میں آئیں سمن کے پھول

دستِ حنائی کس کے اُٹھے فاتحہ کو یہ

شاداب ہو رہے ہیں ہمارے کفن کے پھول

اُس بزمِ رنگ و بو میں اگر بار مل سکے

قرباں اُس پہ ایک نہیں سو چمن کے پھول

○

مجھے ذوقِ باغ و چمن نہیں، مجھے شوقِ سرو و سمن نہیں
میں کروں تو کیا کروں ہمنشیں، کہ نصیبِ صبحِ وطن نہیں

کوئی جام بادۂ شوخ کا، ہمیں جلد ساقیہ ہو عطا
کہ ذرا سی دیر ٹھہرنے کی بھی جگہ، یہ دیرِ کہن نہیں

یہ فسوں کا رنگ کہاں تلک، یہ خموش جنگ کہاں تلک
کہ تری حیا کے زباں نہیں، مری حسرتوں کے دہن نہیں

اُٹھے کیوں نہ سینے سے موجِ خوں، مری آنکھ کیوں نہ ہو لالہ گوں
کہ نظر کے سامنے اے جنوں، وہ نگارِ لالہ بدن نہیں

ماہیے

اُن چاندنی راتوں میں
کھو جاتے تھے جب دونوں، ہم پیار کی باتوں میں
اُن چاندنی راتوں میں

جب دل نہ سنبھلتا تھا
اور عشق مچلتا تھا ارمانوں کی گھاتوں میں
اُن چاندنی راتوں میں

لطف آتا تھا آہوں میں
مچلی ہوئی باہوں میں، پھیلے ہوئے ہاتوں میں

اُن چاندنی راتوں میں

شرماتے تھے نظارے

بہہ جاتے تھے نظارے، بہکی ہوئی باتوں میں

اُن چاندنی راتوں میں

○

دو دن کی جوانی ہے

دنیا سے کوئی پوچھے کیوں اتنی دوانی ہے؟

دو دن کی جوانی ہے

غم خانۂ ہستی میں!

اس خواب کی بستی میں جو چیز ہے فانی ہے

دو دن کی جوانی ہے

اک خواب سہانا ہے

آہوں کا فسانہ ہے اشکوں کی روانی ہے

دو دن کی جوانی ہے

○

شہرود

اختر شیرانی کا آخری مجموعۂ کلام

جسے

بیگم اختر شیرانی نے اختر کی وفات کے

بعد نیّر منزل لاہور سے شائع کیا

شہرود

○

نعت

مسند نشینِ عالمِ امکاں تمہیں تو ہو
اس انجمن کی شمعِ فروزاں تمہیں تو ہو

دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے
اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور
وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمہیں تو ہو

دارائے چرخ و دورِ زمیں جس کے ہیں غلام
وہ نازِ دہر و نازشِ دوراں تمہیں تو ہو

○

نعت

سرکارِ مدینہ! مختارِ مدینہ
دیکھوں کبھی جا کر دربارِ مدینہ

وہ چاندنی راتیں — شاداب کھجوریں

باشرم و حیا سے — سمٹی ہوئی حوریں

زلفوں کو سنوارے — سرشارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ

یثرب کے نگر میں

بلواؤ خدارا — تنگ آئے ہیں غم سے

روتے ہیں شب و روز — فرقت کے ستم سے

ہم درد کے مارے — بیمارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ

نعت

درِ رسولؐ کے ذرّوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے کہکشاں مدینے میں

بہشت چیز ہی کیا ہے کہ ایک سجدے میں
ہمیں تو مل گئے دونو جہاں مدینے میں

مدینے جاتے ہیں پیری میں لوگ سب اختر
مزا ہے کاٹ دو عمرِ جواں مدینے میں

○

نعت

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

زمین و آسماں بھی جس کے در پہ سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا

بشر تھا وہ مگر ایسا، جسے خیر البشر کہئے
غریبوں کی خبر لی اُس نے بیماروں کے کام آیا

مزا جب ہے کہ جائیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں محمد کا وہ مستانہ غلام آیا

بہاریہ

غنچہ و گل کا حسیں ملبوس ہے زیبِ بدن — سر پہ رکھے چاندنی کا تاج آتی ہے بہار

زہرہ و ماہ و ثریا جھومتے ہیں ناز سے — چاندنی راتوں میں جب نغمے سناتی ہے بہار

آہ یہ برکھا کی راتیں، ہائے یہ ساون کی رُت — کیا سہانے سپنے آنکھوں کو دکھاتی ہے بہار

بن کے بادل کی گرج، کیا جانے کس کی یاد میں — رات بھر اکثر حسینوں کو جگاتی ہے بہار

کس کے گوش و گردن و گیسو کی زینت کیلئے — رات بھر بیٹھی ہوئی گجرے بناتی ہے بہار

آج وہ جانِ بہار آنے کو ہے شاید اِدھر — ورنہ یوں گلشن میں کیوں کلیاں بچھاتی ہے بہار

ہمدم اُس جانِ جہاں کی یاد میں بے اختیار — کیا کہیں کس کس طرح ہم کو رلاتی ہے بہار

باغ میں جھولے پڑے ہیں جھولتے ہیں گلبدن
لب پہ ساون کے رسیلے گیت گاتی ہے بہار

ابر چھایا باغ پر، پڑنے لگی مینہ کی پھوار
نوعروسانِ چمن کا مُنہ دھلاتی ہے بہار

مور کوکے، کوئلیں کوکیں، پپیہے بول اُٹھے
کتنے کمسن مطرب اپنے ساتھ لاتی ہے بہار

نغمہ و رقص و مے و مینا کا موسم آ گیا
نشہ کیف و طرب کے پھول اڑاتی ہے بہار

زاہد ہے میری شکستِ توبہ پر کیوں طعنہ زن
دل پہ بس چلتا نہیں جس وقت آتی ہے بہار

دُنیا

یہ دنیا، جو الم آباد افکار محبت ہے
یہ دُنیا جو نظام گاہِ جورِ دستِ قدرت ہے
ہزاروں محفلیں آباد ہیں جس میں گناہوں کی
غموں کی حسرتوں کی رنج کی، اشکوں کی آہوں کی
جہاں ہر وقت برپا ایک اک تازہ قیامت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

جسے کہتے ہیں ہم گہوارہ جنت کی بہاروں کا
جو رمنا ہے ستاروں، سبزہ زاروں، جوئباروں کا
حقیقت میں مگر یہ مقتلِ حسن و صداقت ہے
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

جہاں پنہاں ہیں ماران سیہ شاخوں کے دامن میں
جہاں خونخوار کانٹے ہیں نہاں پھولوں کے دامن میں
جہاں باطل کے پردے میں چھپا روئے حقیقت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

ساقی سے

اُٹھا ساغر کہ دُنیا درپے آزار ہے ساقی
زمانہ ہو کہ قسمت برسرِ پیکار ہے ساقی
پلادے آج تو جتنی مئے گلنار ہے ساقی
کہ پھر ابرِ جواں رقصاں سرِ کہسار ہے ساقی
غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح سے کاٹیں
کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی
پلادے آج تو جتنی پلائی جا سکے مجھ کو
ہمائے عمر اُڑنے کے لئے تیار ہے ساقی
زمانے کی طرح رنگت بدلنا کس سے سیکھا ہے
کبھی اقرار ہے ساقی، کبھی انکار ہے ساقی
مجھے ذوقِ بلانوشی نے یہ کیسی سزا دی ہے
ادھر پیرِ مغاں برہم، ادھر بیزار ہے ساقی
پلادے جتنی چاہے اب تو، مہماں ہیں کوئی دم کے

جرس کا شور گونجا، کارواں تیار ہے ساقی

غنیمت جان اِس صحبت کو پھر ایسی کہاں صحبت

کہ جو منظر ہے مستی کا فضا آثار ہے ساقی

چمن بیخود، دمن بیخود، فضا بیخود، ہوا بیخود

اُفق سرمست ہے، ابرِ رواں سرشار ہے ساقی

پریشاں تو بھی کر دے زلفِ مشکیں دوشِ نازک پہ

کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گل کار ہے ساقی

دلِ غمگیں کو بہلانے کی خاطر در پہ آئے ہیں

مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی

عجب کیا ہے مری کی رات آنکھوں ہی میں کٹ جائے

اِدھر بیخواب ہے اخترؔ، اُدھر بیدار ہے ساقی

چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابر ہوا خوشگوار ہے

موسم ہے، بیخودی ہے چمن ہے بہار ہے

اک آخری خوشی کا فقط انتظار ہے

سرد گل و سمن کے نظاروں کی چھاؤں میں

آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

کہتے ہیں پر سکوں ہے بہت محفلِ عدم

آزادیٔ کشاکشِ غم حاصلِ عدم

آ چل پڑیں جہاں سے سوئے منزلِ عدم
اس کہکشاں کے راہ گزاروں کی چھاؤں میں

آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

آ جا کہ بعد مرگ تو آرام مل سکے
تسکینِ دردِ خاطرِ ناکام مل سکے
درمانِ جورِ گردشِ ایام مل سکے
اس رس بھرے اُفق کے کناروں کی چھاؤں میں

آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اِس خاکداں سے دور ہے اک خاکداں نیا
دُنیا نئی، زمین نئی، آسماں نیا
چھوڑ اس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا
پروین و مشتری کے دیاروں کی چھاؤں میں

آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

ننھا مہماں

سارے گھر میں نو بہارِ زندگی لایا ہے تو

میرے ننھے میہماں کس دیس سے آیا ہے تو

کس بہشتِ حُسن میں اب تک تھا کاشانہ ترا

میرے اُجڑے باغ میں کیونکر ہوا آنا ترا؟
کس زباں میں چپکے چپکے گفتگو کرتا ہے تو؟
کون جانے کس طرح کی ہاؤ ہُو کرتا ہے تو؟
میری بیوی کی ترے رخسار میں رنگت ہے کیوں؟
اجنبی مہمان ہو کر اس کا ہم صورت ہے کیوں؟
تو وہ جذبہ ہے جو دل سے چھن گیا اور پاس ہے
گم شدہ ارماں کا جیتا جاگتا احساس ہے
دو دلوں کی التجا تعمیر ہو کر آ گئی
دو نگاہوں کی یہی تصویر ہو کر آ گئی
گرچہ پاسِ میہمانی و مروّت ہے مجھے
اجنبی مہمان لیکن اک شکایت ہے مجھے
تو نے آ کر میری بیوی کی محبت چھین لی
اُس کا دل چھینا، مرے دل کی مسرت چھین لی
میرے گھر میں میہماں ہو کر تو رہزن بن گیا
اُس کا عاشق ہو گیا اور میرا دشمن بن گیا
اب وہ پہلے کی طرح مجھ پر فدا ہوتی نہیں
مجھ سے رہتی ہے جُدا تجھ سے جُدا ہوتی نہیں
اُف یہ کیسا انقلاب آسمانی ہو گیا
اس کا میرے پاس آنا اک کہانی ہو گیا

چشمِ ظاہر کو نظر آتا ہے طفلِ سادہ تو
کس طرح میری رقابت پر ہوا آمادہ تو

تیرا آنا تھا کہ اس نے بیوفائی سیکھ لی
ایک گھر میں رہ کے بھی مجھ سے جدائی سیکھ لی

تو نے آکر غاصبانہ قبضہ گھر پر کر لیا
گھر پہ قبضہ کیا کیا ہر دل مسخر کر لیا

نوکروں کو بھی نہیں ہے میری راحت کا خیال
سب کے دل میں موجزن ہے تیری راحت کا خیال

تُو نے آتے ہی بہارِ زندگانی لوٹ لی
میری طفلی چھین لی، میری جوانی لوٹ لی

عہدِ پیری آچلا، فصلِ جوانی ختم ہے
میرے رومانوں کی رنگیں داستانی ختم ہے

آثارِ سحر

آثارِ سحر ہوئے نمایاں | انوارِ سحر ہوئے نمایاں
بڑھنے لگی روشنی سحر کی | کملانے لگی ضیا قمر کی

مہتاب کا نور گھٹ رہا ہے | پردہ سا فضا سے ہٹ رہا ہے

گلشن میں نسیم چل رہی ہے | ہر سو خوشبو ابل رہی ہے
مشرق میں عروسِ نور جاگی | آہنگ و ضیا کی حور جاگی

مشرق کا افق جھلک رہا ہے
جامِ سیمیں چھلک رہا ہے

عید کا چاند دیکھ کر

اُفق پہ مسجد کے پاس ہے چاند عید کا محوِ جلوہ باری
کہ بحرِ نیلی پہ تیرتی پھر رہی ہے زرّین اک عماری
جہانِ ہستی کا چپہ چپہ فضائے دامانِ رنگ و بو ہے
زمیں سے تا چرخ آج ہر سمت سازو سامانِ رنگ و بو ہے
ہلال کو جلوہ گر جو دیکھا تو اک حسینہ نے دلبری سے
فلک کی رنگینیوں کی جانب اُٹھائے ہیں ہاتھ خوشدلی سے
نگاہِ خاموش نغمے لاکھوں برستے ہیں جس کی خامشی سے
وہ اس کا چہرہ کہ پھول کوئی کھلا ہے تاروں کی روشنی سے
زبان خاموش عالمِ سرخوشی میں مدہوش و نغمہ زا ہے
حضورِ خالق میں اس کی خاموشی اس طرح مائلِ دعا ہے
الٰہی تیرا ہزار شکر آج پھر خوشی کا زمانہ آیا
ہلالِ عید اک برس کے بعد آج تو نے پھر آنکھ کو دکھایا
دلوں کی بستی میں ہو فروزاں خوشی کی یہ روشنی ہمیشہ
جہاں کے ایک ایک ذرّے کے لب پہ ہو الٰہی ہنسی ہمیشہ

○

دلیرانِ وطن کے نام

سر کٹا کر سرو سامانِ وطن ہونا ہے — نوجوانو! ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے
ان گلوں پر ہو نہ کیوں خلد کو بھی رشک جنہیں — زینتِ گورِ شہیدانِ وطن ہونا ہے
موت بھی روئے گی خون ان کی بُری حالت پر — جن کو مغلوبِ دلیرانِ وطن ہونا ہے

جان دینے کے لئے کیوں نہ ہوں تیار اختر
اک نہ اک دن ہمیں گر جانِ وطن ہونا ہے

سالِ نو پر

(ایک عزیب الوطن سپاہی کا پیغام میدانِ جنگ سے)

سالِ نو آیا ہے اور ہم اپنے گھر سے دور ہیں
پھر بھی اس دُوری کا ہم کو غم نہیں مسرور ہیں
گھر کی خدمت ہی کی خاطر گھر سے چل کر آئے ہیں
پاسبانیٔ وطن کا جذبہ دل میں لائے ہیں

زندگی باقی ہے تو دیکھیں گے اکثر سالِ نو

سالِ نو پر اپنے گھر کو یاد کرنے سے غرض
ہم سپاہی ہیں ہمیں لڑنے سے مرنے سے غرض
حسنِ نو روزی عیاں ہے تیغِ جوہر دار سے
سالِ نو کے نغمے ہم سنتے ہیں ہر جھنکار سے

اپنا پرچم جب عدو کے ملک میں لہرائے گا
اے وطن والو، ہمارا سال نو تب آئے گا

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی
پھر بہار آئی چمن سے بوئے خوں آنے لگی
پھر کوئی مظلوم تیرِ ظلم سے زخمی ہوا
پھر صدائے نالۂ صیدِ زبوں آنے لگی
اشکِ خونیں سے ہوئی لبریز چشمِ سرمگیں
دل سے آوازِ اُمیدِ سرنگوں آنے لگی

تو ایسے سمے میں آ پیاری

گلشن کی فضائیں سب چپ ہیں — بلبل کی نوائیں سب چپ ہیں
کوئل کی صدائیں سب چپ ہیں — آ پریت کے گیت سنا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

تنہائی ہے خاموشی ہے — فطرت غرقِ مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے — بیہوش کو ہوش میں لا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

دنیا ساری خوابیدہ ہے   اور فطرت آرامیدہ ہے
بیدار نظر رنجیدہ ہے   اک سپنا بن کر چھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

ہم عشق کے مارے بیٹھے ہیں   دریا کے کنارے بیٹھے ہیں
بس ایک سہارے بیٹھے ہیں   آ ایک جھلک دکھلا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

غزل

کسی کی جفا بن گئی ہے جوانی   الٰہی یہ کیا بن گئی ہے جوانی
جوانی میں لیں اس قدر بد دعائیں   کہ اک بد دعا بن گئی ہے جوانی
نہیں پوچھتا کوئی اختر خدا کو
یہ کیسا خدا بن گئی ہے جوانی

○

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

○

غزل

دنیا میں ترے عشق کا چرچا نہ کریں گے
مر جائیں گے لیکن تجھے رسوا نہ کریں گے

قربان کریں گے کبھی دل، جاں کبھی صدقے
تم اپنا بنالو گی تو کیا کیا نہ کریں گے
گستاخ نگاہوں سے اگر تم کو گلہ ہے
ہم دُور سے بھی اب تمہیں دیکھا نہ کریں گے
اختر یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں یہ فضائیں
توبہ کریں اس حال میں، توبہ نہ کریں گے

غزل

رنگ لایا ہے کسی بلبل دیوانہ کا خون
سرخیٔ گل سے ہے دامانِ بہار آلودہ
روئے رنگیں پہ پریشاں ہیں سنہری زلفیں
جیسے ہو اک گلِ شاداب، غبار آلودہ
شمعِ اُمید کی کرنیں ہیں پریشاں اختر
دل کا آئینہ کچھ ایسا ہے غبار آلودہ

غزل

پھر عقدۂ حیات و فنا زیرِ غور ہے
پھر زیبِ دوش، گیسوئے پیماں ہے آجکل
پھر ہنس رہی ہے ساری خدائی مرے لئے

پھر سامنے وہ چہرۂ خنداں ہے آجکل

فصلِ بہار و روئے نگار و مئے کہن

حاصل ہر ایک طرح کا ساماں ہے آجکل

ایمان کو عزیز رکھیں ہم تو کس طرح

پیشِ نظر وہ غارتِ ایماں ہے آجکل

بھولا نہیں سبق ابھی دیرینۂ عشق کا

اختر کو گرچہ شکوۂ دوراں ہے آج کل

غزل

ایک اک پھول کو آنکھوں سے لگا کر روئیں

اس بہارِ گل و گلزار کو پھر یاد کریں

چاند کی کرنوں میں اشکوں کے پرودیں موتی

اپنے اس آئینۂ رخسار کو پھر یاد کریں

تسلیاں

نہ رو، نہ رو کہ چمن کی بہار ختم ہوئی

فضائے باغ میں چلنا صبا نے چھوڑ دیا

کلی کلی پہ مچلنا صبا نے چھوڑ دیا

کہ فصل خندہ گر و خوشگوار ختم ہوئی

نہ رو، نہ رو کہ بس اب دورِ جام رخصت ہے

خزاں نصیب ہوئیں وہ شباب کی راتیں
نہ ہات آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں

کہ موسمِ قدحِ لالہ فام رخصت ہو گیا

دلِ حزیں یہی ایام پھر بھی آئیں گے
بہار و لالہ رُخ و جام پھر بھی آئیں گے

تاثیر

میں نے اک نغمہ سنایا تھا تری محفل میں!

ایسی حالت میں کہ تھا سازِ شکستہ میرا
یعنی تارِ نفس، آوازِ شکستہ میرا

دل کا خوں آنکھ میں تھا، آنکھ کے آنسو دل میں!

میں نے دیکھا کہ ترے دل پہ اثر تک نہ ہوا

میری فریادِ حزیں خوابِ پریشاں ہی رہی
دل میں امید جو تھی یاس بداماں ہی رہی

رحم کا تیری نگاہوں میں گزر تک نہ ہوا

ساز کو پھینک دیا بادلِ غمگیں میں نے

اس کے تاروں نے کبھی پھر نہ سنائے نغمے
ناامیدی سے کبھی لب پہ نہ آئے نغمے
گرچہ کتنے ہی لکھے نغمۂ خونیں میں نے

فکاہات

○

مرد اور عورت کی یکرنگی

کل شب کو تھیں اک ہال میں جلوہ کناں حور و پری
یا محوِ رقص و نغمہ تھے صدہا بتانِ آذری
تہذیب کے رنگ سے لبریز تھی ہر اک ادا
ملبوس تھیں عریانیاں ، انداز کی عریاں گری
تھے زلف و گیسو کی جگہ مردانہ فیشن سر کے بال
وہ تھیں کہ صدہا مغبچے مستِ شرابِ دلبری
مردانہ فیشن سے غرض اس کے سوا کوئی نہیں
"تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری"

○

انقلابِ معنی

لغاتِ خانہ میں گیسو بُریدہ ایک گالی تھی
مگر گیسو بریدہ آجکل ہر ایک عورت ہے
فقط گیسو بُری کا ذکر کیا ہے اس زمانے میں
کہ عریانیٔ تن بھی داخلِ تقلیدِ فطرت ہے

○

مطائبہ

پوسٹمین اُس بُت کا خط لاتا نہیں
اور جو لاتا ہے پڑھا جاتا نہیں
عاشقی سے کیوں ہم استعفیٰ نہ دیں
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں
جل گئی سگرٹ سے ڈاڑھی شیخ کی
یہ مگر فیشن سے باز آتا نہیں
بیکری میں نوکری کرنی پڑی
وہ سوائے کیک کچھ کھاتا نہیں
او ستمگر! روکنا موٹر ذرا
میرے خچر سے چلا جاتا نہیں

لانڈری کھولی تھی اس کے عشق میں
پر وہ کپڑے ہم سے دُھلواتا نہیں

○

لُطفِ تمثیل

مغرب کی نعمتیں یوں، مشرق میں بٹ رہی ہیں
چہرے چمک رہے ہیں اور زلفیں کٹ رہی ہیں
ہے حسنِ زارِ نسواں میں انقلاب برپا
دن بڑھ رہے ہیں اختر، اور راتیں گھٹ رہی ہیں

سوزِ ناتمام

رگ رگ میں میٹھی میٹھی خلش سی سما گئی
بے اختیار جب بھی تری یاد آگئی
ابرِ بہار جب کبھی آیا رُلا گیا
بادِ بہار آگ سی دل میں لگا گئی

○

شکوہ سنجِ غمِ پنہانی ہوں — غمزدہ اختر شیرانی ہوں
آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو — آپ کا اختر شیرانی ہوں

مرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تقدیر
دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

○

چمن میں بادۂ گل نے عجب دھوکہ دیا مجھ کو
کہ میں نے شوقِ مے نوشی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

○

سیلاب اشک دیکھ کر حیرت ہے یہ ہمیں
کس طرح چھپ گئے ہیں یہ دریا حباب میں

○

میکدے میں اب بھی ذکر آتا ہے مے نوشی سے تیرا
کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائیگا

○